’’پس کہانیاں کہتے رہو کہ لوگ کچھ تو سوچ بچار کریں‘‘

# قصّے، کہانیاں

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

سرورق ڈیزائن: ارشد خالد



## قصّے کہانیاں کا ای بک ایڈیشن

کتاب ’’قصے کہانیاں‘‘ پہلی بار ’’**افسانے**‘‘ کے نام سے شائع ہونے والی کتاب میں شامل تھی۔ ’’**افسانے**‘‘ میں **روشنی کی بشارت** اور **قصے کہانیاں** دونوں مجموعے ایک ساتھ شائع کیے گئے تھے۔

یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں معیار پبلی کیشنز دہلی نے شائع کی۔ اس کے بعد **قصے کہانیاں** دوسری بار ’’**عمرِ لاحاصل کا حاصل**‘‘ کے پہلے اور عوامی ایڈیشن مطبوعہ ۲۰۰۵ء میں شامل ہوئی۔ اسے بھی معیار پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا تھا۔ تیسری بار یہ کتاب ’’**عمرِ لاحاصل کا حاصل**‘‘ کے لائبریری ایڈیشن میں ۲۰۰۹ء میں شامل رہی۔ یہ ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا تھا۔ اس ایڈیشن میں **روشنی کی بشارت** کے ۱۳، اور **قصے کہانیاں** کے ۱۲ افسانوں کے ساتھ ان مجموعوں کے بعد کے دو افسانے بھی شامل تھے۔ اور اب ۲۰۱۴ء میں میری تخلیقی نثر کے چھ مجموعے ایک ساتھ شائع ہو رہے ہیں تو اس میں افسانوں کے دونوں مجموعوں کے (۱۳+ ۱۲) ۲۵، افسانوں کے بعد کے تین افسانے بھی شامل کر دیئے ہیں۔

**حیدر قریشی**

**انٹرنیٹ ایڈیشن**

## انتساب

اپنے پردادا حضور

**میاں میر محمد قریشی** گڑھی اختیار خاں والے

اور اپنے دادا جی

**میاں اللہ رکھا قریشی** کے نام



"اللہ کو اسی طرح یاد کرو جیسے اپنے
باپ دادوں کو یاد کرتے ہو۔
بلکہ اس سے بھی زیادہ۔۔۔۔"

اپنے اَن دیکھوں کی سوچوں میں گھرا رہتا ہوں میں
اُن کی آنکھیں، اُن کے چہرے، سوچتا رہتا ہوں میں

# ترتیب





# کاکروچ

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی
زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی

’’ایٹمی جنگ کے متوقع خطرات کے پیش نظر میں نے ایٹمی جنگ کے بعد انسان کے حوالے سے ایک کہانی سوچی ہے۔‘‘

نصیر حبیب نے میری بات کو دلچسپی سے سنا اور کہا: ’’کہانی کا خیال سناؤ‘‘۔ لیکن اسی دوران مسعود شاہ بول اُٹھا۔ ’’یار! تم اب تک اسی موضوع پر پہلے ہی دو کہانیاں لکھ چکے ہو۔ اس موضوع کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ لگتا ہے ایٹمی جنگ کرا کے ہی رہو گے‘‘۔ مسعود شاہ اپنے مزاج کے لاابالی پن کے باعث جو منہ میں آئے بول دیتا ہے۔

’’کہانی کا خیال سناؤ!‘‘ نصیر حبیب نے پھر پہلے لہجے میں کہا۔

’’چلو یار! اب کہانی سنا بھی چکو‘‘ مسعود شاہ نے بے زاری کے ساتھ جیسے نصیر حبیب کا ساتھ دیا۔

’’اس کہانی کا آغاز ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان سے ہوتا ہے۔ میں اور ایک عورت اس جنگ میں معجزانہ طور پر بچ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مل کر اس زمین پر آدم اور حوا کی نئی کہانی شروع کرتے ہیں۔ میں نہ صرف صاحبِ اولاد ہو گیا ہوں بلکہ میری اولاد بھی صاحبِ اولاد ہو گئی ہے۔ تاہم کرۂ ارض پر ہماری حالت ایسے ہی ہے جیسے انسان ابھی ابھی غار کے زمانے سے نکل کر

جنگل میں جھونپڑے بنا رہا ہے۔ میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں نہیں جانتے کہ انسان کیسی عظیم تر ترقیات کے دور سے نکل کر جنگل کے دور میں آ گیا ہے''

میں دیکھتا ہوں کہ نصیر حبیب ہی نہیں مسعود شاہ بھی میری کہانی کو سنجیدگی سے سن رہا ہے۔

''ایک دن میرے پوتوں، پوتیوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں انہیں عام معمول سے ہٹ کر کوئی انوکھی سی کہانی سناؤں۔ تب میں انہیں اپنے ترقی یافتہ دور کے حالات بتانے لگتا ہوں۔

'میرے پیارے بچو! یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔ اس کے باوجود کہانی سے زیادہ دلچسپ اور المناک ہے۔ آج سے چند عشرے پہلے  سارے دنیا ہم جیسے انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔ انسان کو دنیا میں ہر طرح کی نعمتیں میسر تھیں۔ سفر پر جانا ہو تو کار سے لے کر ہوائی جہاز تک کی سہولتیں موجود تھیں۔'

'دادا ابو! یہ کار اور ہوائی جہاز کیا ہوتے تھے؟'

میری پوتی نے سوال کیا تو مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ کار ایک سواری تھی جس میں چار پانچ آدمی بیٹھ جاتے۔ اسے صرف ہینڈل کرنا ہوتا تھا وہ خود ہی سواریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی۔ یہاں سے دریا کے کنارے تک کا جو فاصلہ ہم آدھے دن میں طے کرتے ہیں۔ کار ہمیں پل بھر میں وہاں پہنچا دیتی تھی۔

بچوں کے چہروں سے تجسس اور دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔

'اور دادا ابو ہوائی جہاز؟'۔ میرے پوتے نے پوچھا۔

'ہوائی جہاز بہت بڑا ہوتا تھا۔ اس میں کئی سو افراد بیٹھ جاتے تھے تو وہ انہیں اتنی دور تک پہنچا دیتا جتنی دور تم اپنی ساری زندگی میں بھی نہیں جا سکو گے۔ اور ہاں۔ ہوائی جہاز پرندوں کی طرح اُڑ کر جاتا تھا۔ دریاؤں اور پہاڑوں کے بھی اوپر سے گزر جاتا تھا'

میری بات سن کر بچے کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

'دادا ابو اور کیا ہوتا تھا آپ کے زمانے میں؟' اس بار میرے پوتے کے لہجے میں شرارت کی چمک تھی۔



میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر بتانے لگا اُس زمانے میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، فیکس...'

'دادا ابو! یہ ریڈیو کیا ہوتا تھا؟'

'یہ ایک چھوٹا سا بکس ہوتا تھا۔ اس کے بٹن گھمانے سے کبھی گیت سنائی دیتے۔ کبھی ساری دنیا کی خبریں، کبھی لوگوں کی گفتگو'

'اور ٹیلی ویژن ؟'

'ریڈیو والی ساری چیزیں ٹیلی ویژن پر سنائی بھی دیتی تھیں اور دکھائی بھی دیتی تھی۔ یعنی اگر کوئی آواز آ رہی ہے تو اس کا چہرہ بھی دکھائی دیتا اور وہ شخص ہماری طرح ہی چلتا پھرتا اور بولتا نظر آتا تھا'

ننھے منے معصوم بچوں نے میری بات سن کر اتنے زور سے قہقہے لگائے کہ میں خفیف سا ہو گیا۔ وہ مجھ سے پہلے زمانے کی اور دلچسپ باتیں سننا چاہتے ہیں مگر میں کہتا ہوں۔ پیارے بچو! میں اب تھک گیا ہوں اس لیے باقی باتیں کل سناؤں گا۔

پھر میں ان کے جھونپڑے سے نکل آتا ہوں۔ جھونپڑے سے باہر آ کر یونہی خیال آیا اور میں رُک کر بچوں کی آوازیں سننے لگا۔ میرا ایک پوتا کہہ رہا تھا: 'دادا ابو زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں اس لئے اچھی اچھی کہانیوں کو اپنے زمانے کے واقعات سمجھنے لگ گئے ہیں'

میرے باقی سارے پوتے پوتیاں اس کے تبصرے کی تائید میں ہنس رہے تھے''

میں نے کہانی ختم کی تو مسعود شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''یار! اگر جنگ میں صرف تم اور ایک عورت ہی بچتے ہو تو بچوں کی شادیاں  کیسے کیں؟ کیا پھر بہن بھائیوں کی شادیاں کرا دیں؟''

''اگر آپ کو اس میں الجھن محسوس ہوتی ہے تو جنگل کے قریب دریا کے کنارے پر ایک اور مرد، عورت بھی جنگ سے بچا دیتا ہوں'' میں نے وضاحت کی۔

''یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تو کہانی لکھتے وقت خود اپنی راہ بناتی جائیں گی۔ میں ایک اور اہم مسئلے کی طرف توجہ  دلانا چاہتا ہوں'' نصیر حبیب نے سنجیدگی سے کہا ''ایٹمی جنگ کے بعد سطح زمین پر کسی انسان کا زندہ بچ رہنا سائنسی طور پر ممکن نہیں۔ اس لئے بچ رہنے والوں کو آپ کس بنیاد پر

بچا رہے ہیں؟''

''میری کہانی بنیادی طور پر فکشن ہے، اسے آپ سائنسی مضمون تو نہ سمجھیں'' میں نے نصیر حبیب کے اعتراض کے جواب میں کہا۔

''میں تو فکشن کی اہمیت کا معترف ہوں''نصیر حبیب نے متانت سے کہا'' بلکہ میرے نزدیک سائنس کی بنیاد بھی فکشن پر ہے۔ ہر نیا سائنسی انکشاف پہلے فکشن ہوتا ہے۔اس لئے میں نے جو نکتہ اٹھایا ہے پہلے مجھے اس کی تفصیل بیان کر لینے دیں۔''

میں تو نصیر حبیب کی تفصیل سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا ہی۔مسعود شاہ بھی خلاف توقع سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''سطح زمین پر ایٹمی جنگ کی صورت میں کوئی ذی روح مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی۔صرف وہ مخلوق زندہ رہ سکتی ہے جس میں Nuclear Poison ہو۔کیونکہ صرف یہی Element ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے۔مثلاً Lead ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے لیکن اگر انسانی خون میں Lead شامل ہو تو پھر اسے ہلاک کرنے کے لئے ایٹمی جنگ کی بھی ضرورت نہیں، انسان ویسے ہی مر جائے گا''

آپ کا مقصد یہ ہے چونکہ انسانی خون شریانوں میں ہوتا ہے اس لیے اس کی موت واقع ہو جائے گی لیکن بعض ذی روح ایسے ہیں کہ ان کے ہاں شریانوں والا سسٹم نہیں ہے مثلاً مکھی کے جسم میں خون کی الگ تھیلی ہوتی ہے، اس لئے اگر اس کے جسم میں Nuclear Poison ہو تو اس کی موت واقع نہیں ہو گی''

میری بات سن کر نصیر حبیب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔''آپ کی کہانی اب بنے گی۔مکھی کی جگہ کاکروچ لے لیں۔فرض کر لیں کہ کاکروچ کے وجود میں بھی ایسا سسٹم ہے کہ تابکاری اثرات اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ الٹا اس کی Growth کرتے ہیں۔لہٰذا ایٹمی جنگ کے بعد سارے ذی روح مر جائیں گے سوائے کاکروچ کے۔اور تابکاری اثرات سے جب ان کی Growth ہو گی تو آنے والے زمانے میں اس زمین کے حکمران اور مالک یہی کاکروچ ہوں گے جو انسانی قد کے



برابر ہو جائیں گے''۔

نصیر حبیب کی کہانی سن کر مسعود شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ٹھہریں!''میں نے ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے کہا''کہانی تو ہزاروں سال پہلے بن چکی ہے''

نصیر حبیب نے مجھے الجھے ہوئے انداز سے دیکھا۔

''دوستو!ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں''

''کیا؟''نصیر حبیب اور مسعود شاہ کی آوازوں میں گھبراہٹ تھی اور پھر وہ اس طرح اپنے آپ کو دیکھنے لگے جیسے واقعی کسی پرانے زمانے کے کاکروچ ہوں۔

☆☆☆

# روشن نقطہ

طور سے بڑھ کے اپنا حال ہوا
صرف اک بار من میں جھانکے تھے

''میں محبت کیا ہارا، دین اور دنیا بھی ہار گیا''

پیر سائیں نے میری بات سن کر مجھے غور سے دیکھا:

''محبت میں ہار جیت کوئی معنی نہیں رکھتی'' پیر سائیں کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی ''لیکن پہلے اپنا قصہ سناؤ''

''وہ مجھے چاہتی ہے۔ میں بھی اسے چاہتا ہوں مگر وہ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہے اور جان بوجھ کر بھٹکتی پھر رہی ہے''

''مجھے وہ خاصی ذہین لگتی ہے۔ جان بوجھ کر بھٹکنے والے لوگ غیر معمولی ہوتے ہیں'' پیر سائیں بھی شاید اس کے چاہنے والے نکلے۔

''محبت کی شدت کے باوجود اس نے آج تک حجاب قائم رکھا ہے'' میں نے اذیت کے ساتھ کہا۔

''**المحبۃ حجاب بین المحب والمحبوب**۔ محبت خود محبوب اور محبّ کے درمیان پردے کا نام ہے'' پیر سائیں نے آنکھیں موند کر عالم استغراق سے کہا۔

''اگر محبت خود پردہ ہے تو پھر یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟'' میں نے پیر سائیں سے سوال کیا۔

''پردہ ہمارے اپنے اندر ہوتا ہے۔ اگر یکتائی کے سفر راست طور پر کئے جائیں تو سارے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔''



''پیر سائیں! مجھے وہ سفر بتائیں۔ میں پھر سے اپنا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنا چاہتا ہوں''

میں نے ادب کے ساتھ درخواست کی۔

پیر سائیں نے گہری سانس لی اور بولے:

''محبت کے چار سفر ہیں۔ کامیابی کے لئے یہ سفر ضروری ہیں
محبّ سے محبوب کی طرف۔ محبوب سے محبّ کی طرف
محبّ سے محبّ کی طرف۔ محبوب سے محبوب کی طرف''

''پیر سائیں! کیا ان اسفار کے بعد گوہر مقصود مل جاتا ہے؟''

میں نے خوشی کے ساتھ سوال کیا۔

پیر سائیں نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے پھر ادب کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔ پیر سائیں نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ میں نے نظر اٹھا کر پیر سائیں کی طرف دیکھا۔ ان کا گلا رندھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور شدتِ غم سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پیر سائیں بھی محبت ہارے ہوئے تھے۔

''اللہ اکبر'' پیر سائیں کے ڈیرے پر بیٹھے ہوئے ایک فقیر نے نعرہ لگایا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پیر سائیں نے بھی اسے حیرت سے اس طرح دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ اب وہ اپنی غم کی حالت پر بھی قابو پا چکے تھے۔

''پیر سائیں! آپ تو شاید صرف محبت ہارے ہوئے ہیں مگر میں تو دین و دُنیا بھی ہار چکا ہوں''

''دین کو سمجھنے کے لئے دنیا کو سمجھنا ضروری ہے۔ تمام عوالمِ الٰہی کو سمجھ کر ہی کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔''

''مگر مجھے تو کسی نتیجے کا انتظار نہیں۔ میں تو اپنی بازی ہار چکا ہوں'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''محبت کے اسفار کی طرح عوالم الٰہی کو بھی چار حصّوں میں بیان کیا جا سکتا ہے''

پیر سائیں نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا

''یوں تو عوالمِ الٰہی لامتناہی ہیں مگر اپنی سہولت کے لئے ہم نے انہیں چار حصّوں میں تقسیم کر

رکھا ہے''۔

''پیر سائیں۔ میں اپنی دنیا ہارنے کی بات کر رہا ہوں، آپ کون و مکان کی باتیں فرما رہے ہیں'' میں نے پھر پیر سائیں کو اپنے مسئلے کی طرف لانے کی کوشش کی۔ مگر بے سود!

''پہلا عالم، عالمِ زمان ہے۔ یہ ایسا عالم ہے جس کی اِبتدا اور اِنتہا دونوں ہیں۔

دوسرا عالم، عالمِ دہر ہے۔ اس عالم کی ابتدا معلوم مگر انتہا نامعلوم ہے۔

تیسرا عالم، عالمِ سرمد ہے۔ اس کی ابتدا بالکل نظر نہیں آتی مگر انتہا سمجھ میں آتی ہے۔

چوتھا عالم، عالمِ ازل ہے۔ اس کی نہ ابتدا کا پتہ ہے نہ اِنتہا کی خبر ہے''

پیر سائیں چاروں عوالم بیان کر کے تھوڑا سا رُکے اور پھر بولے:

''اب بتاؤ تم کونسی دُنیا ہارے ہو؟''

مجھے پیر سائیں کی پہلی بات کی سمجھ آ گئی۔ ''دین کو سمجھنے کے لئے دنیا کو سمجھنا ضروری ہے۔'' واقعی ان دنیاؤں میں تو سب کچھ ہی آ گیا ہے اور میں اپنا آپ ہار چکا ہوں۔

''حضرت! کیا یہ وہی چار عوالم ہیں جنہیں لاہوت، جبروت، ملکوت اور ناسوت بھی کہا جاتا ہے؟''

''ہاں۔ یہ وہی دنیائیں ہیں۔ محبت کے چاروں اسفار ہوں یا عوالمِ الٰہی کے اسفار ہوں۔ طے ہونے پر آئیں تو ایک ہی جست میں طے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ سفر شروع کرنے سے پہلے طے ہو جاتے ہیں۔ اور طے نہ ہوں تو آدمی ساری زندگی چکراتا پھرے۔ بھول بھلیاں میں ہی رہے گا۔''

میں نے پیر سائیں کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہاں گہرے کرب کے آثار نمایاں تھے۔ لاحاصلی کا دکھ اپنے آپ ظاہر ہو رہا تھا۔ مجھے پیر سائیں بھی بھول بھلّیاں میں چکراتے نظر آئے۔

''اللہ اکبر''

مجذوب فقیر نے پھر نعرہ لگایا اور مجھے محسوس ہوا کہ پیر سائیں اس بار گھبرا گئے ہیں۔

''پیر سائیں! اس بھول بھلیاں سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟''

مجھے بھی مجذوب فقیر سے کچھ خوف محسوس ہونے لگا۔



''توحیدِ خداوندی پہ کامل ایمان'' پیر سائیں نے مجذوب فقیر کو دیکھ کر تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''تو پھر مجھے توحید کا بھید سمجھا دیں''

''توحید کا بھید!'' پیر سائیں کی آواز لرزی ''تم نے سنا نہیں۔ جو توحید کے بارے میں سوال کرتا ہے وہ جاہل ہے۔ اور جو کوئی جواب دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ مشرک ہے کیونکہ 'بے مثال' کے بارے میں بتانے کے لئے اسے کسی مثال کا سہارا لینا پڑے گا'' پیر سائیں کی لرزتی آواز اب جوش سے بھرنے لگی تھی۔ ''اور جو توحید کی معرفت کا دعویٰ کرے وہ ملحد ہے کیونکہ خدا لامحدود ہے اس لئے اس کا عرفان کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکتا اور۔ جو توحید کو نہ سمجھے وہ کافر ہے'' پیر سائیں کے بیان سے میں جھومنے لگا۔

مجذوب فقیر نے بھی الا اللہ۔ الا اللہ کی صدائیں بلند کیں۔

''سائیں پھر تو ساری بات ایک الف پر ہی تمام ہوتی ہے'' مجھے بلھے شاہ یاد آ گئے۔

''تم نے الف سے آگے کا سبق نہیں پڑھا۔ الف بھی زیادہ ہے''

اس دفعہ پیر سائیں کی بجائے مجذوب فقیر بولا اور مجھے یوں لگا جیسے بھونچال سا آ گیا ہے۔ پیر سائیں بھی اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''علم ایک نقطہ ہے جسے جاہلوں نے بڑھا دیا ہے'' مجذوب فقیر اپنی لے میں بولا ''الف تو بہت زیادہ ہے۔ بات ایک نقطے میں تمام ہو چکی ہے۔''

پیر سائیں، مجذوب فقیر کی بات سن کر تڑپے اور بے ہوش ہو گئے۔

دور کہیں سے بلھے شاہ کی کافی گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اک نقطے وچ گل مُکدی اے.....

پیر سائیں اور مجذوب دونوں ایک نقطے میں ڈھل گئے تھے۔

اس نقطے سے عجیب سکون بخش روشنی پھوٹ رہی تھی۔

اور یہ روشنی میرے دل سے پھوٹ رہی تھی!

☆☆☆

# دو کہانیوں کی ایک کہانی

مشینوں کے اس عہدِ ناروا کا میں ہی یوسف ہوں
مجھے اس نوکری کی شکل میں نیلام ہونا تھا

بچپن میں جب میں نے پہلی بار الٰہ دین کے چراغ والے جن کی کہانی سنی تھی تو جن کا نام سن کر ڈر جانے کے باوجود مجھے کہانی اچھی لگی تھی۔ آج کارخانے کی چمنی سے اٹھتے ہوئے گہرے سیاہ دھویں کو دیکھ کر میں نے سوچا ہے کہ ابھی اس میں سے ایک جن نمودار ہوگا اور میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر درخواست کرے گا۔ ''کیا حکم ہے میرے آقا۔۔؟''
اور پھر میرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ میرے چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی۔ لیکن جن کی بجائے سامنے سے کارخانے کا سخت دل اور کرخت زبان مالک آ جاتا ہے۔ میں خوفزدہ ہو کر وہاں سے ہٹ جاتا ہوں۔

☆☆

شاہ جی سے ایک دفعہ ''منطق الطیر'' کے مسئلے پر بات ہوئی تو انہوں نے بُل اور بُلبُل کی ایک دن کی زندگی کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا پورا احوال سنا ڈالا۔ بعض جانوروں سے لے کر درختوں اور پودوں تک سے اپنی بات چیت کی کہانیاں سنا دیں۔ میں شاہ جی کا بہت احترام کرتا ہوں اس لئے ان کی باتوں کا یقین نہ کرنے کے باوجود چپ ہو رہا۔ شاہ جی میری خاموشی کو بھانپ گئے۔ اسی لمحے روشنی کا چھناکا سا ہوا اور عجیب سا شور چاروں طرف بکھر گیا۔



میں نے دیکھا شاہ جی کی کلائی پر ایک مچھر آن بیٹھا ہے لیکن یہ مچھر محض مچھر نہیں تھا۔ وہ واضح طور پر ایک بوڑھا ڈاکٹر لگ رہا تھا جس نے سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں سرنج لئے وہ شاہ جی کو انجکشن لگانے کے لئے ذرا سا جھکا۔
''جناب والا! کیوں مجھ غریب کے درپے ہیں؟ شاہ جی نے بڑی ملائمت کے ساتھ مچھر سے کہا۔
''یہ میری ڈیوٹی ہے جناب'' مچھر نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''لیکن جناب! میں زیادتی خون کا مریض نہیں ہوں'' شاہ جی نے کہا۔
''میں نے ایک قطرہ کا پتہ نہیں کتنا حصہ خون لینا ہے۔ کیا فرق پڑے گا اس سے.....'' مچھر نے کسی شفیق ڈاکٹر کی طرح مسکراتے ہوئے کہا، اپنی عینک کو ماتھے پر چڑھایا اور پھر کلائی کی طرف جھکتے ہوئے بولا ''اور ہاں...... یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ معمولی سا خون لینے کے عوض میں ایک ایسا مادہ بھی خارج کرتا ہوں جو آپ کے اندر فالج کے حملے کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرتا ہے'' اتنا کہہ کر مچھر نے شاہ جی کو انجکشن لگا دیا۔ شاہ جی صرف مسکرا کر رہ گئے۔ میں کسی معمول کی طرح کھویا کھویا سا اپنے آپ میں واپس آ گیا۔

☆☆

کارخانے کی چمنی سے نکلتے ہوئے دھویں کی سیاہی دیکھ کر سوچتا ہوں اس میں میرا لہو شامل ہے تو پھر دھواں اتنا سیاہ کیوں ہے؟ جن کا خون سفید ہو چکا ہے وہ میری سلامتی کے علمبردار ہیں۔ چمنی سے نکلتا ہوا گہرا سیاہ دھواں ان کی طرف سے میری حمایت میں سوگ کی علامت ہے۔ لیکن میرے سفید و سیاہ پر سارا اختیار انہیں کو حاصل ہے۔ الٰہ دین کا چراغ میرے ہاتھ میں ہے لیکن اب اس کی روایت بدل چکی ہے۔ اب جن کے احکامات کی بجا آوری الٰہ دین کا فرض ہے۔
چمنی سے اٹھتے سیاہ دھویں کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ شاید چراغ کا جن ابھی حاضر ہونیوالا ہے۔ میں اسکے احکامات کی تعمیل کے لئے پہلے ہی مؤدب ہو کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

☆☆

''منطق الطیر'' والے تجربے کے بعد سے میں شاہ جی کا بہت زیادہ معتقد ہو گیا ہوں لیکن

آج شاہ جی نے ایک پیر جی کا احوال سنا کر حیران کر دیا۔شاہ جی اُن پیر جی سے بے حد متاثر نظر آ رہے تھے۔کہنے لگے:

''میں نے پیر جی سے پوچھا یہ آپ نے اتنا بڑا مزار کیوں بنا رکھا ہے؟

میری بات سن کر مسکرائے اور بولے''یہ تو صرف لوگوں کو جمع کرنے کا بہانہ ہے کیونکہ من حیث القوم ہم مردہ پرست ہیں۔زندوں کو مار ڈالتے ہیں اور مرے ہوؤں پر پھول چڑھاتے ہیں۔بس اسی وجہ سے مزار بنوانا پڑا''

میں پیر جی کی صاف گوئی سے بڑا متاثر ہوا۔پھر ان کے علم کا اندازہ لگانے کے لئے ان سے **الم** کے معنی پوچھے۔انہوں نے مجھے ششدر کر دیا۔

''یہ نفس کی تین حالتوں کا بیان ہے۔امّارہ۔لوّامہ۔مطمئنہ''

پیر جی نے علم ومعرفت کی اتنی بڑی بات ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر دی۔میں تب سے اب تک اسی عارفانہ سرور میں بھیگا ہوا ہوں''

شاہ جی کی پیر جی سے ملاقات کی روداد نے مجھے بھی مسحور کر دیا۔

☆☆

کارخانے کی رہائشی کالونی میں میرے کوارٹر سے ملحقہ کوارٹر کی ایک زلیخا نے مجھے ایک عرصے سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔میں نہ یوسف ہوں نہ پیغمبر۔جبکہ زلیخا کے مقابلے کے لئے حسنِ یوسف اور شانِ پیغمبری دونوں کو یک جا کر دیا جاتا ہے۔میں ان دونوں خوبیوں سے محروم، زلیخا کے سامنے کھڑا کانپ رہا ہوں۔آخر میں گنہگار کیوں اس کڑی آزمائش میں ڈال دیا گیا ہوں۔میں شیطان سے لڑتا رہا۔ساری رات مقابلہ ہوتا رہا۔میں ہانپنے لگا جبکہ شیطان اسی طرح تازہ دم تھا۔آخر میں کوارٹر سے بھاگ نکلا۔کارخانے پہنچا تو وہاں کارخانے کے مالک کی شکل میں شیطان پھر میرا منتظر تھا۔اس کے چہرے پر بڑا سفّاک مسکراہٹ تھی اور وہ بالکل تازہ دم تھا جبکہ میں نڈھال ہو چکا تھا۔

☆☆



میں نے اپنا سارا دکھ شاہ جی کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ان کی آنکھوں میں ایک ملکوتی چمک پیدا ہوئی۔

''شیطان ہمارے اندر بھی ہوتا ہے اور باہر بھی۔جنّوں میں بھی، انسانوں میں بھی اور ان سے سوا بھی۔شیطان کے لاکھوں روپ اور کروڑوں حربے ہیں۔ہم عاجز انسان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' شاہ جی ذرا دم لینے کو رُکے اور پھر گویا ہوئے''ہم شیطان کو مار نہیں سکتے اس لئے کبھی بھی شیطان کے ساتھ نہیں لڑنا۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔یاالٰہی! یہ شاہ جی کیا کہہ رہے ہیں؟۔میں نے پریشانی کے عالم میں سر اٹھا کر شاہ جی کو دیکھا۔ان کی آنکھوں میں وہی ملکوتی چمک تھی۔

''ہاں۔ہم شیطان کو ہلاک نہیں کر سکتے اس لئے کبھی بھی شیطان کے ساتھ نہیں لڑنا۔بس جتنا ہو سکے اس نامراد سے بچ کر رہو اور اِس سے دور بھاگو۔اس سے دور بھاگنے ہی میں عافیت ہے اور یہی تقویٰ ہے''

شاہ جی کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔

☆☆

آج شاہ جی سے پورے سات دن بعد ملاقات ہوئی۔وہ کچھ بجھے بجھے سے تھے۔میرے استفسار پر انہوں نے بتایا:

''میں پھر پیر جی کے ہاں گیا تھا''

''اچھا!'' میں نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

''پیر جی کہنے لگے میں خدا سے براہ راست گفتگو کرا سکتا ہوں''

''خدا سے براہِ راست گفتگو۔مکالمہ الٰہیہ۔'' خوشی سے میری آواز لرزنے لگی۔

''میرے لئے بھی یہ بڑی پُرکشش بات تھی'' شاہ جی بھرائی ہوئی آواز میں بولے

''پھر۔؟''

''پیر جی کی شرط ہے کہ خدا سے بات کروانے کے عوض انہیں ایک سجدہ کیا جائے''

’’خدا سے بات کرانے کے عوض پیر جی کو سجدہ!‘‘ میرا دل بیٹھنے لگا ’’پھر آپ نے کیا کہا؟‘‘

’’میں نے پیر جی سے کہا کہ جناب سر تو ایک ہی ہے اور یہ جسے دینا تھا دے چکا ہوں۔ اگر دوسرا سر ہوتا تو ضرور سجدہ کرتا‘‘ شاہ جی کی بھرائی ہوئی آواز پر جوش ہوگئی ’’پیر جی سے اتنا کہہ کر میں واپس آ گیا۔‘‘

’’شاہ جی! اب میری کہانی بھی سُن لیں‘‘ میں نے پھیکی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کہا۔

شاہ جی نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں ’’سناؤ تمہاری کہانی کیا ہے؟‘‘

’’شاہ جی! آپ نے کہا تھا نا کہ شیطان جِنّوں میں بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں بھی اور یہ کہ ہم شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سو کارخانے کے مالک اور کالونی کی زلیخا۔ میں دونوں میں سے کسی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور ان دونوں سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی، میں کارخانے کی نوکری چھوڑ دوں۔ اور شاہ جی! میں نے نوکری چھوڑ دی ہے‘‘

’’تو تم نے نوکری چھوڑ دی؟‘‘ شاہ جی نے بے حد دکھی لہجے میں پوچھا۔

مجھے یوں لگا جیسے شاہ جی نوکری اور کوارٹر چھوڑ کر آئے ہیں اور میں پیر جی کو جواب دے کر آیا ہوں۔ اور ہم دونوں شیطان سے لڑ کر نہیں بھاگ کر آئے ہیں۔

☆☆☆



# گھٹن کا احساس

ہم نے بھوگا ہے صرف اسے حیدرؔ
ہم نے کب زندگی گزاری ہے

بچپن میں اُس کی ماں اُسے نلکے کے نیچے بٹھا کر نہلایا کرتی تھی۔ اس کا بھائی نلکے کی ہتھی چلاتا، ماں اُس کے پورے جسم پر صابن مَل کر اسے اچھی طرح سے صاف کرتی۔ ماں کا نہلانا اُسے اچھا لگتا تھا لیکن جب وہ اس کے منہ پر صابن لگاتی اور اسے آنکھوں میں اس کی چبھن محسوس ہوتی تب وہ تکلیف کے باعث اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا۔ صابن سے بھی زیادہ گھبراہٹ اُسے اُس وقت ہوتی جب اُس کا سر نلکے کے پھن کے عین نیچے ہوتا۔ پانی سیدھا اُس کے سر اور چہرے پر امنڈتا چلا آتا اُسے ایسا لگتا جیسے وہ کسی گہرے پانی میں ڈوب رہا ہو۔ وہ گھبراہٹ کے مارے چیخنے لگتا۔ ایسے موقعہ پر اس کا بھائی شرارت سے نلکے کی ہتھی کو زیادہ تیزی سے چلانے لگتا۔ اُس کی گھبراہٹ تڑپنے جیسی حالت میں بدل جاتی۔ تب ماں اسے سینے سے لگا لیتی۔ ماں کے سینے سے لگتے ہی اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو جاتی۔

لڑکپن میں ایک بار اُسے اپنے باپ کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا موقعہ ملا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا تو خوفزدہ ہو گیا۔ وہ بلندی اور پانی دونوں سے ڈرنے لگا۔ اسے زمین سے جڑے رہنے میں عافیت محسوس ہونے لگی۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا بلندی اور

پانی سے اس کا خوف بڑھتا گیا۔ایک بار وہ ایک بائیس منزلہ عمارت کی آخری منزل پر گیا۔ بائیسویں منزل کے ایک فلیٹ کی بالکونی سے جب اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اسے لگا وہ ابھی نیچے گر پڑے گا۔ اس نے بالکونی سے پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ جڑ کر آہستہ آہستہ کمرے کی طرف سرکنا شروع کیا اور جب وہ تین میٹر کا فاصلہ طے کر کے بالکونی کے ساتھ ملحقہ کمرے میں گیا تو اس کا سانس ایسے پھولا ہوا تھا جیسے وہ ۳۰۰ میٹر کی دوڑ کے آخری پوائنٹ پر پہنچا ہو۔

جوانی میں ملازمت کے باعث اسے کئی گھر تبدیل کرنے پڑے۔ اسے اتفاق کہیں کہ ہر گھر کا باتھ روم بے حد مختصر ہوتا۔ نہانے والا سمٹا کر شاور کے نیچے کھڑا ہو سکتا تھا۔ کئی بار اس نے سوچا اس سے تو بچپن کا وہ نلکا اور کھرّا بہتر تھا۔ وہاں ایسی گھٹن تو نہیں تھی۔ تنگ باتھ روم میں جا کر کبھی کبھی اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی ملنگ ہے جو کسی شہزادی پر فریفتہ ہو گیا ہے اور بادشاہ نے اسے سزا کے طور پر دیواروں میں زندہ چُن دینے کا حکم دے دیا ہے۔ تب وہ نہائے بغیر ہی گھبرا کر باہر نکل آتا۔ نہاتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی پوری کمر پر نہیں پھر سکتا تھا۔ ماں کا کمر پر صابن مَلنا یاد آتا تو اس کا جی چاہتا کاش ماں زندہ ہوتی اور اب بھی میری کمر پر صابن مَل دیتی۔ ایسے ہی خیالوں کے دوران ایک بار اُس نے اپنی بیوی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ اس کی بیوی نہ صرف اس کی ماں کی بھتیجی تھی بلکہ بڑی حد تک اس کی ماں کی ہم شکل بھی تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نہاتے وقت اس کی کمر پر صابن مَل دیا کرے۔ اس کی بیوی تھوڑا سا شرمائی پھر کہنے لگی: ''مجھ سے یہ فلموں والے باتھ روم کے سین نہیں ہو سکتے'' وہ بیوی کے جملے پر مسکرایا اور سوچا یہ پگلی کہاں جا پہنچی۔ یوں بھی باتھ روم میں اتنی جگہ ہی کہاں ہے کہ وہ بھی میرے ساتھ سما سکتی۔

ایک دن اس نے اخبار میں خبر پڑھی: ایک عورت جسے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا تھا دو دِن کی مشقّت کے بعد اپنی قبر اُدھیڑ کر باہر نکل آئی یہ خبر پڑھ کر اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ کسی زندہ انسان کو مردہ سمجھ کر دفن کر دینا۔ لیکن قبر کے اندر لیٹا ہوا انسان کیسے اسے اُدھیڑ سکتا ہے؟ اس نے خوف اور حیرت سے سوچا۔ پھر اس نے فرض کیا کہ اسے بھی اسی طرح مردہ سمجھ کر دفن



کر دیا جائے تو وہ اپنی قبر اُدھیڑ سکے گا یا نہیں۔ وہ تو سچ مچ وہیں دَم گھٹ کر مر جائے گا اور پھر گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ رات کو جب سردی کے باعث اس نے کمبل اپنے منہ پر لیا، اسے ایسے لگا جیسے وہ کفن میں لپٹا ہوا قبر میں پڑا ہے۔ اس نے گھبرا کر کمبل کو چہرے سے ہی نہیں، سینے سے بھی اُتار پھینکا اور بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بعد میں اس نے اپنے ایک دوست کو اپنی گھبراہٹ اور گھٹن کے احساس کے بارے میں بتایا تو اس نے اسے مشورہ دیا کہ تیراکی سیکھ لو۔ اب وہ اپنے دوست کو کیا بتاتا کہ وہ بچپن سے نلکے کے پانی سے بھی خائف ہے۔ تیراکی کیسے سیکھ لے! سو اس نے دوست کے مشورے کو مذاق کے رنگ میں ٹال دیا'' کیا پتہ کل کلاں مجھے مہینوال کا کردار کرنا پڑ جائے پھر دریا میں ڈوبنے کے بجائے تیر کر پار لگ جاؤں گا اور محبت کی رسوائی ہو جائے گی''

اس عرصہ میں اوزون کا مسئلہ، آلودگی کا مسئلہ اور ایٹمی جنگ کا امکانی خطرہ۔ ان موضوعات پر اس کا مطالعہ بڑھتا گا۔ وہ سوچتا: انسان نے مختلف نظریات اور مزعومہ برتری کی لڑائیوں میں نفرت کی آلودگی بڑھائی، بلندیوں کی آرزو میں اوزون میں شگاف ڈال دیئے، صنعتی ترقی اور اسلحے کی دوڑ میں ماں جیسے مقدس پانی کو ناپاک کر دیا، جنگلوں کو اُجاڑ دیا، اتنے ہولناک نیوکلیائی ہتھیار بنالئے کہ دھرتی کا دم گھٹ کر رہ جائے۔ یہ ساری بلندیاں انسانیت کو قبر میں گرانے والی ہیں۔ جیتے جی قبر میں گرانے والی۔ اور پھر اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔ ایسے ہی خیالوں میں کھویا ہوا وہ ایک بار ٹرین کا سفر کر رہا تھا۔ جب سوچتے سوچتے اس کا دم گھٹنے لگا وہ اٹھ کر ٹرین کے دروازے کے قریب آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اس نے گیٹ کے دائیں بائیں نصب شدہ دونوں ڈنڈوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اندر آتی ہوئی تیز ہوا سے گھٹن کا احساس کم ہونے لگا۔ اسے قدرے سکون مل رہا تھا لیکن پھر یکا یک اس کے ذہن میں عجیب سا خیال آیا۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دو۔ پھر یوں لگا جیسے یہ خیال نہیں کوئی غیبی آواز ہے جو اسے حکم دے رہی ہے: چھلانگ لگا دو۔ وہ گھبرا کر اپنی سیٹ کی طرف لوٹ آیا۔ اگر وہ مزید تھوڑی دیر گیٹ پر کھڑا رہتا تو یقیناً چھلانگ لگا دیتا۔ اس واقعہ کے بعد وہ کسی بھی بلندی والی جگہ جاتا، اسے

یہی آواز سنائی دینے لگتی: نیچے چھلانگ لگادو۔ چھلانگ لگادو۔اور وہ گھبرا کے نیچے آجاتا۔

اُس دن وہ صوبائی دارالحکومت سے واپس آرہا تھا۔ رستے میں ماں، باپ کی قبروں پر جانے کی آرزو ہوئی اس لئے ان کے شہر کی طرف چل پڑا۔ وہاں ان دنوں رستے میں دریا کا پُل زیرمرمّت تھا۔ کام کی وجہ سے ساری رات پُل پر آمدورفت معطل رہتی تھی۔ اسے اس کا علم نہیں تھا۔لیکن اب دریا کے اِس طرف آ گیا تھا تو دوسری طرف جا کر ماں، باپ کی قبروں پر دعا کئے بغیر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے وہ دریا کے اس طرف مزے سے رات بسر کرسکتا تھا۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ صبح رستہ کھلتے ہی دریا کے پار چلا جائے گا۔لیکن رات دس بجے کے قریب ایک شخص اس کے پاس آیا اوراس نے بتایا کہ وہ دریا کے دوسری طرف والے شہر کا باسی ہے اور ایک چھوٹے سے پُل سے واقف ہے جہاں سے پیدل دریاپار کیا جاسکتا ہے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس شخص کے ساتھ چل پڑا۔ یہ بمشکل دوفٹ چوڑا پُل تھا جس کے ایک طرف لوہے کے پائپوں کا جنگلہ سا بنا تھا اور دوسری طرف سے بغیر جنگلے کے تھا۔ اس نے آدھا پُل بے خیالی میں پار کرلیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو پُل صراط پر چل رہا ہے۔ اس نے جنگلے کو پکڑے ہوئے اوپر دیکھا۔ ریلوے لائن والے پُل پر چندھیا دینے والی روشنی تھی۔ وہاں مزدور کام کررہے تھے۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ نیچے نظر دوڑائی تو گرمیوں کا چڑھتا ہوا دریا تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔تب اسے جتنی دعائیں یاد تھیں اس نے ان کا وِرد شروع کردیا ان میں علم میں اضافے سے لے کر والدین کی مغفرت تک کی کئی غیر متعلق دعائیں بھی شامل تھیں۔ نہ وہ اوپر دیکھ سکتا تھا نہ نیچے۔تب اس نے اپنے آگے والے ہم سفر کو دیکھا تو وہ غائب تھا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کون تھا اور کیوں مجھے یہاں تک لاکر غائب ہوگیا۔ دریا کے دوسری طرف والے شہر کے رہنے والے نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟ ان خیالوں اور سوالوں کے ساتھ اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ ایک طرف گہری تاریکی تھی اور ایک طرف ٹرین کے پُل پر ہونے والی تیز روشنی۔ گھبراہٹ میں اس کا ایک ہاتھ جنگلے سے ہٹ گیا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں دریا کا چڑھتا ہوا پانی تھا، اضطراری طور پر اس کا دوسرا ہاتھ بھی جنگلے سے ہٹ گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے



تھے۔ پھر اسے وہی آواز سنائی دینے لگی: چھلانگ لگادو.... نیچے چھلانگ لگادو۔ پھر دریا میں گہری چھپاک کی آواز اس نے خود ہی سنی تھی۔ اس کے بعد اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں اسے نہلا رہی ہے۔ اس نے اس کے منہ پر صابن مَل دیا ہے۔ بھائی نے نلکے کی ہتھی تیز چلانی شروع کردی ہے۔ گھبرا کر وہ تھوڑا سا تڑپا تو ماں نے بے تاب ہوکر اسے سینے سے لگالیا۔

اس کی ساری گھبراہٹ دور ہوچکی تھی۔

☆☆☆

# بھولے کی پریشانی

ہماری بے خبری بھی بجا سہی حیدؔر
پر اس کی برہمی بھی تو کسی سبب سے ہے

خدا کی قسم۔۔۔۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔ میں چوہدری اللہ دتہ صاحب کے گھر اُس وقت سے نوکر ہوں جب میری عمر بمشکل سات سال کی تھی۔تب میرے غریب ماں باپ کے لئے مہینے کے بیس روپے بڑی دولت تھے جو میری تنخواہ کے طور پر انہیں ملتے تھے اور میرے لئے چوہدری صاحب کے گھر کا مزیدار کھانا، جو میں جی بھر کے کھا سکتا تھا، بہت بڑی نعمت تھی۔آج جب مجھے اس گھر کی خدمت کرتے اور اس کا نمک کھاتے اٹھارہ سال ہوگئے ہیں میں نمک حرامی کیسے کرسکتا ہوں۔ مجھ پر تو چوہدری صاحب اور اللہ بخشے چوہدرانی جی کو ہمیشہ بھروسہ رہا۔ جوان ہوجانے کے بعد بھی میں نے اس خاندان کی کسی لڑکی کو کبھی میلی نظروں سے نہیں دیکھا۔نہ کبھی رقم کا کوئی ہیر پھیر کیا۔پھر آج مجھ پر نمک حرامی کا الزام کیوں لگایا گیا ہے؟

اللہ بخشے چوہدرانی جی بڑے پیار سے کہا کرتی تھیں کہ بھولے تو سچ مچ بھولا ہے۔ پر ایمانداری کی بات ہے میں اتنا بھولا بھی نہیں ہوں یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات سب کچھ اچھی طرح جانتے ہوئے بھی بھولا بن جاتا ہوں۔نمک حلالی کے لئے بھولپن بہت ضروری ہے۔ میں نے چوہدری اللہ دتہ صاحب کے گھر میں بہت کچھ دیکھا ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھا بھی ہے



اس کے باوجود مجال ہے میں نے کسی بات کی بھنک باہر پڑنے دی ہو۔میں نے تو ہمیشہ پردہ پوشی کی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں پندرہ برس کا تھا۔گھر پر چوہدری صاحب کی دونوں چھوٹی بیٹیاں رفیعہ بی بی اور ماجدہ بی بی ہوتی تھیں۔باقی لوگ امریکہ گئے ہوئے تھے۔تب ماجدہ بی بی اپنے کمرے کی بجائے بیٹھک میں سوتی تھیں۔ ہر رات دس بجے کے قریب ایک خاص طرز کی ہلکی سی دستک ہوتی تھی اور ماجدہ بی بی بیٹھک سے گلی میں ہوتی تھیں۔مجھے علم ہے ان کے ہمسایوں کا لڑکا ڈاکٹر عبدالخالق ان سے چوری چھپے ملنے آتا تھا پر میں نے آج تک کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ہاں۔ایک بار میں دل ہی دل میں ہنسا ضرور تھا۔ماجدہ بی بی کی کہیں اور شادی ہوگئی۔تین پیارے پیارے بیٹے ہو چکے تھے۔تب لاہور سے ان کی بھتیجی کی شادی کی ویڈیو فلم آئی تھی۔اس میں گھر کی بچیوں نے خوب ناچ گانا کیا تھا۔شادیوں کے موقعہ پر سارے گھروں میں ایسا ناچ گانا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے اللہ بخشے چوہدرانی جی موٹی تازی ہونے کے باوجود بیاہوں کے موقع پر خود ناچ گانے میں حصہ لیا کرتی تھیں۔۔۔لیکن اپنی رشتے کی بھتیجی کی شادی کی ویڈیو فلم دیکھ کر ماجدہ بی بی نے کہا تھا یہ کیسٹ بچوں کے سامنے نہیں چلانا، ان کی تربیت پر برا اثر پڑے گا۔تب میں دل ہی دل میں بہت ہنسا تھا۔پر میں نے آج تک ماجدہ بی بی کو بھی یہ خبر نہیں ہونے دی کہ مجھے ان کے ڈاکٹر عبدالخالق سے ملنے ملانے کے سارے چکروں کا پتہ ہے۔

سلیمہ بی بی کی ایک بیٹی رئیسہ نے جب محلے میں پر پُرزے نکالنے شروع کئے۔ مجھے ساری باتوں کا علم تھا پر کیا کرتا، نمک حلالی کا تقاضہ تھا کہ خاموش رہتا۔یوں بھی ان کے ایک رشتہ دار نے جب سلیمہ بی بی کو ان کی بیٹی رئیسہ کی سرگرمیوں کے بارے میں تھوڑا سا آگاہ کیا تھا تا کہ کسی بڑی خرابی کے ہونے سے پہلے ہی بچ بچا کر لیا جائے تو سلیمہ بی بی خرابی دور کرنے کی بجائے الٹا اس رشتہ دار سے لڑنے چلی گئی تھیں۔اپنی سب سے بڑی بہن حلیمہ بی بی کو بھی ساتھ لے گئیں۔لڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس رشتہ دار نے جو بات پہلے پردے میں رکھ کر کہی تھی پھر کھول کر بیان کر دی اور اس کھول کر بیان کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ حلیمہ بی بی نے سلیمہ بی بی کی دوسری بیٹی راشدہ کا رشتہ لینے کی جو بات پکی کر رکھی تھی اسے توڑ دیا۔اپنے بیٹے کا بیاہ کہیں اور کر دیا۔حالانکہ اللہ جانتا ہے راشدہ

بی بی تو بہت ہی اچھی اور نیک بچی ہے۔رئیسہ بی بی جیسی بالکل نہیں ہے۔سلیمہ بی بی کا میاں جب اپنی بیٹی کے لچھنوں سے آگاہ ہوا تو دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ بڑا غیرت مند چوہدری تھا جی !۔ اس قسم کی ڈھیر ساری باتیں میرے علم میں ہیں پر میں نے آج تک اس خاندان کی پردہ پوشی کی ہے کیونکہ میں اس گھر کا نمک خوار ہوں۔

اللہ بخشے چوہدرانی جی بہت بڑے دل والی تھیں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب کاروبار کے سلسلے میں ایک بار افریقہ گئے تو تین سال کے بعد واپس آئے۔ پھر گئے تو پانچ سال کے بعد واپس آئے۔مجال ہے چوہدرانی جی کے جیتے جی کبھی ایسی کوئی بات ہوئی ہو۔ یہ ساری باتیں تو بڑی چوہدرانی جی کے اٹھ جانے کے بعد ہی ہونے لگی تھیں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب ویسے بڑے متقی انسان ہیں۔ سچی بات ہے میں نے ان میں عیب اور گناہ والی کوئی بات نہیں دیکھی پر اب تہتر برس کی عمر میں انہوں نے نئی شادی کر کے بڑی زیادتی کی ہے۔ بوڑھوں میں ہی نہیں، جوانوں میں بھی ان کی ٹور تو بن گئی ہے کہ اس عمر میں بھی اتنا دم خم ہے کہ نئی شادی کر لی۔ پر ایسی ٹور کا فائدہ ؟۔اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ جب تہتر برس کی عمر میں بھی چوہدری اللہ دتہ صاحب سے صبر نہیں ہو سکا تو پھر اُس زمانے میں انہوں نے خاک صبر کیا ہوگا جب وہ کئی کئی برس بیرون ملک اکیلے گزار کر آتے تھے۔تب وہ اچھے بھلے جوان تھے۔ضرور اِدھر اُدھر منہ مارا ہوگا لیکن مہارت کے ساتھ۔

لوگ چوہدری صاحب کے منہ پر بے شک بات نہ کریں لیکن آپس میں سب باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے خود لوگوں کی باتیں سنی ہیں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب نے دوسری شادی بھی کی تو کیسی فضول سی جگہ۔ یہ عورت عمر میں تو ان سے بیس سال چھوٹی ہے لیکن پہلے ایک جج کی بیوی رہ چکی ہے۔جج نے اس پر برائی کا الزام لگا کر اسے طلاق دے دی تھی ۔اور وہ عورت ابراہیم کی بیٹی جو نئی چوہدرانی کی گہری دوست ہے۔ منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔اس نے شادی والے دن چوہدری اللہ دتہ صاحب کو سالی بن کر دودھ پلایا تھا اور دودھ پلائی کے پیسے لئے تھے۔نئی چوہدرانی کی یہ منہ بولی بہن اپنے گاؤں کی وہ تاریخی لڑکی ہے جو اپنی جوانی میں گاؤں سے بھاگی تھی۔ کسی لڑکی کے اُس گاؤں سے بھاگنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔کم بخت بھاگی بھی غیر مذہب والے



کے ساتھ۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ چوہدری اللہ دتہ صاحب نے بڑی چوہدرانی جی کی جگہ پر ایک ایسی پَرکٹی کو لا بٹھایا ہے جو پاک دامنی کے معاملہ میں ہماری بڑی چوہدرانی جی کے قدموں میں بیٹھنے کے بھی لائق نہیں۔ یہ تو جی سراسر ظلم ہے!

یہ لوگ باگ بھی بڑے فنکار ہیں۔ عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ایک کہہ رہا تھا کہ نکاح کے چھوہاروں اور مکھانوں کے ساتھ ٹافیاں اور غبارے کیوں تقسیم کئے گئے؟ کیا پتہ کیوں تقسیم کئے گئے۔ایک کہہ رہا تھا کہ چوہدری اللہ دتہ صاحب اندر سے بالکل خالی ہیں۔ پھوکی ٹور بنانے کے لئے انہوں نے شادی کا تماشا کیا ہے۔اگر واقعی چوہدری میں دم خم ہے تو پھر اس بیوی سے بھی اولاد پیدا کر کے دکھادیں۔وہ حرامی جب یہ بات کر رہا تھا مجھے ایسا لگا جیسے چوہدری اللہ دتہ صاحب نے یہ بات سن لی تھی۔

میں بھی کہاں کی باتیں لے بیٹھا۔میرا رونا تو صرف یہ ہے کہ میں نمک حرام نہیں ہوں۔ دراصل کل رات چوہدری اللہ دتہ صاحب نے مجھے کہا تھا کہ ان کے بیڈروم کی سیٹنگ تھوڑی سی تبدیل کر دوں۔اس سلسلہ میں انہوں نے کچھ ضروری ہدایات بھی دی تھیں۔انہوں نے مجھے اپنے بیڈروم تک پہنچایا تھا اور دروازے سے ہی لوٹ گئے تھے۔ میں اندر گیا تو وہاں نئی چوہدرانی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے کمرے کی سیٹنگ تھوڑی سی تبدیل کرنی ہے اس لئے وہ ذرا باہر تشریف لے جائیں لیکن وہ باہر جانے کی بجائے میرے قریب آ گئیں۔ان کی آنکھیں اور چہرہ عجیب سا ہوتا جا رہا تھا۔اب میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا کرنے لگی تھیں۔ جب وہ مجھ سے بالکل ہی لپٹ گئیں تب میں گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگا لیکن بدحواسی میں مجھ سے دروازہ نہیں کھل سکا اور میں قریب کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا۔ باہر سے گھوم کر میں اندر آیا۔ چودھری اللہ دتہ صاحب کو تلاش کیا۔ پتہ نہیں وہ بتائے بِنا کہاں چلے گئے تھے۔مجبوراً میں پھر چوہدری صاحب کے بیڈروم کی طرف گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بیڈروم کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کنڈی کھولی تو نئی چوہدرانی سامنے کھڑی تھیں۔ان کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔انہوں نے قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور ’’نمک حرام‘‘ کہہ کر بیڈروم کا دروازہ زور سے اندر سے

بند کرلیا۔

بتایئے بھلا میں نے نمک حرامی کہاں کی ہے۔ خدا کی قسم میں نمک حرام نہیں ہوں۔

چوہدری اللہ دتہ صاحب کل رات کے کہیں گئے ابھی تک واپس نہیں آئے۔ وہ آجاتے تو وہ خود گواہی دیتے کہ بھولا اور سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن نمک حرام نہیں ہوسکتا۔ پر یہ چوہدری اللہ دتہ صاحب کل رات سے اچانک کہاں چلے گئے ہیں اور ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟

اور وہ بیڈروم کی کنڈی باہر سے کس نے لگائی تھی؟

رب جانے یہ کیا چکر ہے!

☆☆☆



# شناخت

زندگی کی ہر برہنہ شاخ پر تحریر ہیں
پھول چہروں پر جو ٹوٹے زرد لمحوں کے عذاب

''پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ''

''پاکستان۔ پلیدستان''

''لے کے رہیں گے پاکستان''

''ست سری اکال......''

''حیّ علی الصّلوٰۃ......''

''بانگ نئیں دین دیاں گے۔ ساڈیاں رتاں بانگیاں جاندیاں نیں''

''مسجد شہید گنج......''

''گورو گوبند سنگھ جی کے بچے......''

''ہندو مسلم بھائی بھائی''

جے ہند۔ جے ہند''

ایک زوردھماکہ ہوا۔ زندگی کانپنے لگی۔ پاکستان آزاد ہوگیا۔ اس کے ذہن میں سارے

منظر، ساری تاریخ اتھل پتھل ہوکر رہ گئی۔ کوئی منظر ٹھیک طرح سے آنکھوں میں نہیں سما رہا۔ تاریخ کا کوئی حصہ ڈھنگ سے ذہن میں نہیں آرہا۔ چاروں طرف آگ اور خون کا کھیل تھا، ان کے قافلے پر حملہ کر دیا گیا تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں سب گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں گہرا اندھیرا اُتر آیا تھا مگر اچانک اس اندھیرے میں روشنی کی ہلکی سی لکیر ابھری۔ قریبی کھیتوں میں اسی روشنی کی لکیر کے سہارے وہ چھپتے چھپاتے ساتھ والے گاؤں جانکلی تھی مگر وہاں پہنچ کر اس کی آنکھوں میں اُترا ہوا اندھیرا اور گھنا ہوگیا تھا اور روشنی کی اس ہلکی لکیر نے بھی اس اندھیرے میں دم توڑ دیا تھا:

''کون ہو تم؟؟''

''جی۔م۔میں۔رشیدہ ہوں''

''ہا۔۔ہاہاہا۔۔۔'' شیطانی قہقہے اس طرح گونجے جیسے کسی ملک کو فتح کرنے کا آخری مرحلہ آگیا ہو۔

''مجھے میری ماں کے پاس پہنچادیں۔خدا کے لئے!۔ مجھے میرے پاکستان بھجوادیں۔'' وہ گڑگڑائی

''سنو! تم اب رشیدہ نہیں، پرکاش کور ہو''

بے بسی کی حالت کے باوجود پتہ نہیں اس میں کہاں سے اتنی قوت آگئی۔ اس نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا:

''میں مسلمان ہوں اور میرا نام رشیدہ ہے، رشیدہ!''

تب سکھ لیڈر کے اشارے پر سات سکھوں نے اسے دبوچ لیا اور اسے بازوؤں، ٹانگوں اور بالوں سے پکڑ کر کسی انجانی سمت لے جانے لگے۔ رستے میں سکھ لیڈر نے طنزاً کہا:

''اب بتاؤ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟''

''لا الٰہ الا اللہ.....'' انہوں نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا مگر پھر بھی اس نے جیسے تیسے پورا کلمہ پڑھ دیا''.....محمد الرسول اللہ''

وہ اسے ایک خالی مکان میں لے گئے اور وہاں جا کر ایک کمرے میں زور سے پٹخ دیا۔



''اسلام کے دشمنو! انسانیت کے دشمنو! ہماری اذانیں بند کرنے والے کتو اور درندو!''

رشیدہ کے منہ سے گالیوں کا طوفان بہہ نکلا۔ لیڈر سکھ نے باقی سکھوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود اس پر تھپڑوں کی بارش شروع کر دی۔ تشدد کے باوجود اسے اصرار تھا کہ وہ رشیدہ ہے اور اسے اس کی ماں کے پاس یا پھر پاکستان پہنچایا جائے۔ تب لیڈر سکھ نے نہ صرف اس کی آبروریزی کی بلکہ اس عمل کے دوران اسے باور کراتا رہا کہ وہ اب رشیدہ نہیں پرکاش کور ہے کیونکہ اب وہ مسلمان نہیں سکھ ہے۔

تکلیف اور اذّیت کے عالم میں ''لے کے رہیں گے پاکستان'' ''جئے ہند'' اور ''ست سری اکال'' کے سارے نعرے بھی اسے ریپ کرتے رہے اور اسے اس کا نیا نام یاد کراتے رہے۔ وہ چیخی چلائی تو لیڈر سکھ نے دھمکی دی کہ اگر وہ درست نہ ہوئی تو وہ اپنے گروہ کے باقی سات جوانوں کو بھی اندر مدعو کر لے گا۔ تب وہ نہایت بے بسی کے ساتھ سسک پڑی اور درست ہوگئی اور اسے یقین آگیا کہ اس کا نام رشیدہ نہیں پرکاش کور ہے اور پھر وہ سچ مچ پرکاش کور بن گئی۔ لیڈر سکھ سریندر سنگھ کی بیوی!

اس کے اندر کی رشیدہ کبھی اس سے گزرے ہوئے، بھوگے ہوئے اور سنے ہوئے واقعات کی کوئی بات کرتی تو وہ اسے سختی سے ڈانٹ دیتی۔ کسی نعرے کا مطلب پوچھتی تو اسے ٹوک دیتی۔ سکھوں کے دور میں مسلمانوں کی اذانوں پر پابندی کی بات ہو یا مغلیہ دور میں گورو گوبند سنگھ جی کے بچوں کے قتل کا واقعہ، پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ ہو یا پلید ستان۔ وہ تو اپنا مطلب، اپنے معانی گم کر بیٹھی تھی۔ اس کے لئے اب ہر چیز بے معنی تھی۔ پھر اس نے اپنی بے معنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا اور اس سمجھوتے نے بے معنویت سے ایک نئی معنویت پیدا کر دی۔ دو گبھرو بیٹے اور ایک خوبصورت بیٹی۔ لیکن وہ جب بھی اپنے ماحول سے مطمئن ہونے لگتی، اندر کی بے اطمینانی اور بڑھ جاتی۔ اطمینان اور بے اطمینانی کی اسی حالت میں زندگی کو جھیلتے، بھوگتے وہ بڑھاپے کی منزل تک آگئی۔

☆☆

تب یکا یک ایک اور دھماکہ ہوا۔ زندگی کانپنے لگی۔

''اندرا گاندھی قتل ہوگئیں''

انتہا پسند ہندوؤں کو کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ سکھوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا۔ اس کے ذہن میں خوفناک وسوسے اور اندیشے سر اٹھانے لگے، وہ اپنے کمزور اور بوڑھے ہاتھوں سے اپنی جوان بیٹی کو مضبوطی سے تھامنے لگی۔ فساد شدت اختیار کرنے لگا۔ سریندر سنگھ سرکاری حفاظتی کیمپوں میں رہائش کا بندوبست کرنے گیا ہوا تھا۔ تب اس کے گھر کی دہلیز پر ہی اس کے دونوں جوان بیٹے قتل کر دیئے گئے اور گھر کو آگ لگا دی گئی۔ وہ اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لے کر گھر کی پچھلی طرف سے دیوار پھاند گئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے گئی ہوں گی کہ پیچھے سے للکار سنائی دی:

''ٹھہرو!۔۔۔کون ہو تم؟''

''ج ج....جی....'' وہ ہکلائی۔ سینتیس[۳۷] سال پہلے کا زمانہ پھر اس کے سامنے آ گیا

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''پرکاش کور۔۔۔۔نہیں۔۔۔رشیدہ۔۔۔۔، جی ہاں رشیدہ''

''جھوٹ بولتی ہو۔ تم مسلمان نہیں ہو، سکھ ہو''

''گورو کی سوگند۔ بھگوان کی قسم۔ میں رشیدہ ہوں اور یہ میری بیٹی ہے۔۔ چترا۔۔۔ نہیں اس کا نام چترا نہیں.....اس کا نام.....''

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی، سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ اس کے سوچتے سوچتے اور دیکھتے دیکھتے سامنے کا منظر بدل چکا تھا۔۔۔۔ چترا ایک مکان کے کمرے میں مقید تھی اور وہ برآمدے میں بے بس بندھی کھڑی تھی۔ آٹھوں بدمعاش اس کی بیٹی کو باری باری ریپ کر رہے تھے۔ چترا بے ہوش ہو چکی تھی مگر بلوائیوں کے انتقام کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں سارے منظر، ساری تاریخ اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی حالت ایسے انسان کی طرح تھی جس کے چاروں طرف الگ الگ موضوعات کی کئی فلمیں پوری آواز کے ساتھ چل رہی ہوں اور اسے کچھ بھی نہ سوجھ رہا ہو۔



اسے محسوس ہوا کہ اس کے سامنے چترا نہیں وہ خود پڑی ہوئی ہے اور وحشیوں کا یہ غول اسے اس کا نام یاد کرا رہا ہے۔ ہر آدمی اسے سریندر سنگھ نظر آتا ہے۔

''رشیدہ نہیں پرکاش کور۔۔۔۔۔۔۔۔ پرکاش کور نہیں رشیدہ...''

تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نام نہیں اور کوئی مذہب نہیں۔

وہ صرف ایک لڑکی ہے۔ ایک عورت ہے۔

یہی اس کا نام ہے۔

یہی اس کا مذہب ہے۔

☆☆☆

# انکل انیس

باہر کے شیطان خرابی سی کر جاتے ہیں
ورنہ ہر انسان کی فطرت نوری ہوتی ہے

مسز توصیف انور میری دور کی رشتہ دار ہیں۔ بس نام کا رشتہ ہے البتہ ان کے شوہر انور صاحب سے میرا محبت کا گہرا رشتہ ہے۔ ان کی پہلی بیوی فوت ہوگئیں تو انہوں نے اپنی بہن کی مدد سے مسز توصیف سے شادی کر لی۔ تب انور صاحب ۴۵ سال کے تھے اور مسز توصیف ۲۵ سال کی۔ اگرچہ مسز توصیف نے شادی سے پہلے یہ بات چھپائی تھی کہ وہ طلاق یافتہ ہیں تاہم کچھ ان کی کم عمری نے اور کچھ انور صاحب کی طبعی شرافت نے اس اخفا کو مسئلہ نہیں بننے دیا۔

یہ لگ بھگ بیس برس پہلے کی بات ہے۔ انور صاحب کی پہلی بیوی سے چھوٹی بیٹی اپنی پھوپھی کے ہاں تھی۔ مجھے وہاں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ نو سال کی بچی کو لاہور انور صاحب کے گھر پہنچا آؤں۔ ٹرین سے رات بھر کا سفر کر کے جب میں لاہور پہنچا تو انور صاحب آفس جا چکے تھے۔ سفر کی تھکن کے باعث میں نہا کر اور ناشتہ کر کے سو گیا۔ پھر پتہ نہیں کیسے میری آنکھ کھلی، لیکن جب میں جاگا تو ڈرائینگ روم سے عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ انور صاحب کی بیٹی کسی مہمان کو انکل انیس کہہ رہی تھی۔ انکل انیس مُصر تھے کہ بچی باہر سے جا کر اسکنجبین کے لئے لیموں خرید آئے۔ بچی بھی اپنی معصومیت میں کہہ رہی تھی ہاں انکل! میں ابھی جا کر لے آتی ہوں لیکن مسز توصیف بار بار بچی کو باہر جانے سے روک رہی تھیں۔ آخر ان کی سرگوشی جیسی آواز سنائی دی:



''انیس! بے وقوفی مت کرو۔ اندر انور صاحب کا ایک عزیز سویا ہوا ہے''

اس سرگوشی کی آواز سن کر میں جان بوجھ کر سویا ہوا بنا رہا حالانکہ میرا پورا وجود جاگ گیا تھا۔

میں جنس کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھتا ہوں۔ معاشرتی حدود میں رہ کر اس کے تقاضے پورے ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر کوئی ان سماجی حدود کو باہمی رضامندی اور خاموشی سے پھلانگتا ہے تو میں اس پر بھی خاموش رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ہر کسی کی اپنی زندگی ہے۔ کوئی جیسے چاہے بسر کرے۔ میں دو دن لاہور رہا۔ اس دوران انکل انیس سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے مسز توصیف یا انکل انیس کو ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ مجھے ان کے ناجائز مراسم کا علم ہو گیا ہے۔ بعد میں جب کبھی کبھار لاہور جانا ہوتا، انور صاحب کے گھر پر انکل انیس سے بھی ایک آدھ ملاقات ہو جاتی۔ لیکن چند برسوں کے بعد مجھے یہ حیران کن خبر معلوم ہوئی کہ انور صاحب کے ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے دوستانہ مراسم تھے۔ انور صاحب کے گھر پر اس دن کوئی نہیں تھا چنانچہ انور صاحب اور وہ ہیڈ مسٹریس تنہائی کی موج میں دوستانہ مراسم سے آگے، کافی آگے تک چلے گئے۔ انور صاحب زندگی میں پہلی بار گناہ کی لذت سے آشنا ہوئے تھے جبکہ مسز توصیف اس میدان کی تجربہ کار کھلاڑی تھیں۔ انہوں نے ایک ہی جھٹکے میں انور صاحب سے سچ اگلوا لیا اور پھر قرآن اٹھوایا کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔ انور صاحب جو پہلے ہی عمروں کے نمایاں فرق کے باعث بیوی کے دباؤ میں تھے مزید دباؤ میں آگئے۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا، مجھے شدید دکھ ہوا۔ انور صاحب کا گناہ بے شک گناہ تھا۔ لیکن ان سے قرآن اٹھوانے والی مسز توصیف کو اس کا کیا حق پہنچتا تھا؟۔ چھاج تو بولے پر چھلنی کیوں بولے۔

ہماری دنیا، سارے معاشرے، سارے فرقے، سب کے نزدیک مجرم وہی ہے جو پکڑا جائے۔ جو مہارت کے ساتھ جی بھر کر گناہ کرے، جرائم کا مرتکب ہو لیکن پکڑا نہ جائے وہ متقی، پرہیزگار اور مومن ہے۔ بارہا یہ خیال آئے کہ انور صاحب کو جا کر ان کی بیگم کے کرتوت بتا دوں، پھر سوچتا چلو انور صاحب پر ایک قیامت تو گزر چکی اب انہیں ایک اور قیامت سے کیوں دوچار کروں۔ جیسی بھی سہی ان کی زندگی گزر تو رہی ہے، گھر بسا تو ہوا ہے۔ آخر میں نے راز افشا کرنے

کی بجائے پردہ پوشی کرنے کو ترجیح دی۔ایک عرصہ گزر جانے کے بعد آج مجھے یہ ساری باتیں پھر سے یاد آ گئی ہیں۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ میں ہوٹل پر لنچ کرنے گیا تھا۔وہاں اچانک انکل انیس دو معزز بیگمات شمیم خانم اور رضیہ بیگم کے ساتھ آن ٹپکے۔رسماً یا مروتاً ہی نہیں میں نے انکل انیس کو دلی طور پر اپنے ساتھ لنچ کی دعوت دی جو بخوشی قبول کر لی گئی۔دوران گفتگو پتہ چلا کہ لبرل سوچ رکھنے والے دوستوں نے مل کر خواتین کے حقوق کے سلسلے میں ایک نئی تنظیم قائم کی ہے۔اس تنظیم کی نئی شاخیں کھولنے کے لئے اور کارکردگی بڑھانے کے لئے مختلف شہروں کا دورہ کیا جا رہا ہے۔میرے ساتھ ان کی ملاقات اتفاقیہ تھی اور اسے کھانے کی میز پر ہلکی پھلکی گپ شپ تک ہی محدود رہنا چاہئے تھا لیکن تنظیم سازی کے جوش میں میرے سامنے بھی انہوں نے خواتین کے حقوق کے مسئلہ پر رٹی رٹائی جوشیلی باتیں شروع کر دیں۔میں خواتین کے حقوق کا مخالف نہیں ہوں۔خواتین کو معاشرے میں ان کا جائز مقام ملنا چاہئے۔صدیوں سے روا رکھی جانے والی ناانصافی کا خاتمہ ہونا چاہئے لیکن انکل انیس کے منہ سے خواتین کے حقوق کی باتیں مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ایک مرحلے پر میں نے ان سے پوچھا ''اس انقلابی مہم میں مسز توصیف نے آپ کا ساتھ نہیں دیا؟''

''ارے وہ تو نری مولوانی ہے۔اسے ایسے انقلابی محاذ پر آنے کی ہمت ہی نہیں''

انکل انیس کا جواب سن کر جی چاہا کہہ دوں ''انکل! وہ مولوانی ہرگز نہیں ہیں۔انہوں نے نماز اور تسبیح کی آڑ لے کر آپ کے ساتھ ناجائز مراسم قائم کرنے کی ہمت کر لی تھی تو اس کارِ خیر میں آگے آنے کی ہمت کیوں نہیں کر سکتیں۔'' لیکن میں یہ بات نہ کہہ سکا۔اس کی بجائے میں نے انہیں بتایا کہ ''جن عورتوں پر ظلم ہوتے ہیں وہ زیادہ تر دیہاتوں میں رہتی ہیں،شہروں کے تنگ و تاریک محلّوں میں رہتی ہیں۔اس لئے اگر آپ واقعی خواتین کے حقوق کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اپنی تنظیم کی بیگمات کو کام کرنے کے لئے دیہاتوں میں بھیجئے،شہروں کے پرانے اور تنگ و تاریک محلوں میں بھیجئے۔سیٹلائٹ ٹاؤن اور اس طرح کی نئی آبادیوں میں مقیم خواتین بڑی حد تک اپنے حقوق سے آگاہ ہیں''۔



تب انکل انیس کی بجائے شمیم خانم نے مجھے ٹوکا اور بتایا کہ ''ماڈرن علاقے کی خواتین کے حقوق بھی پامال ہو رہے ہیں۔ہم نے اپنا کام ابھی شروع کیا ہے۔آہستہ آہستہ ہم پسماندہ محلوں اور دیہاتوں کی طرف بھی جائیں گے۔ہمیں اس غیر متوازن معاشرے کو متوازن بنانا ہے''

''آپ کے خیال میں یہ متوازن معاشرہ کیسے وجود میں آئے گا؟''

''جب مرد اور عورت کی تفریق کے بغیر صرف انسان کی بات کی جائے گی''

''اگر یہ بات ہے تو پھر انسان کے زمرہ میں صرف مرد اور عورت کو ہی نہیں سمجھیں۔مخنّثوں کو بھی اس میں شامل کریں۔انسانی برادری میں سب سے زیادہ تضحیک،ظلم اور استحصال کا شکار تو پھر مخنث طبقہ ہے۔''

''یہ طبقہ بھی مردانہ چیرہ دستی کا شکار ہے''اس بار رضیہ بیگم بولیں۔

''تو پھر آپ لوگ اپنی جدوجہد انکل انیس کے بغیر شروع کریں'' میری بات سن کر انکل انیس نے قہقہہ لگایا لیکن ان کے چہرے سے خفّت عیاں تھی۔

''نہیں۔ابھی ہماری جدوجہد ابتدائی مرحلے میں ہے اس لئے ہمیں ابھی صرف خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنا ہے اور اس کارِ خیر میں جو مرد حضرات ہمارا ساتھ دیں گے ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے''،شمیم خانم نے بڑے سلیقے سے جواب دیا۔

''مرد ساری زندگی عیاشی کرتا رہے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔عورت سے زندگی میں ایک بار بھول ہو جائے تو اس کی ساری زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے'' رضیہ بیگم کے لہجے میں تلخی تھی،انہوں نے جیسے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔میں بھی اسی سمت مڑ گیا:

''تو کیا اس جدوجہد کا یہ مقصد ہے کہ چونکہ مرد عیاشی کرتے ہیں اس لئے عورتوں کو بھی عیاشی کرنے کا حق ملنا چاہئے''

''دیکھیں! اب آپ شدید زیادتی پر اُتر آئے ہیں'' انکل انیس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''آپ مجھے یہ بتائیں کہ جس طرح مرد اپنی کسی رشتہ دار عورت کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر غیرت کے نام پر قتل کر دیتا ہے۔عورت کو بھی آپ ایسی ہی غیرت کا مظاہرہ کرنے کا حق دیں گے

جب اسکا کوئی قریبی رشتہ دار ویسی ہی قابل اعتراض حالت میں پایا جائے؟'' رضیہ بیگم کی بات میں خاصا وزن تھا لیکن میرا اندر کا مسئلہ تو انکل انیس کو زچ کرنے کا تھا اس لئے میں نے پینترا بدل کر بات سنبھالنی چاہی،

''میں تمام معزز خواتین سے معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے بتائیں کہ خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے کی دعوے دار خواتین میں کتنی ہیں جو عاصمہ جہانگیر کی طرح ٹھوس اور عملی کام کر رہی ہیں اور کتنی ہیں جو سیمیناروں اور دَوروں کے ذریعے اپنے شوہروں کے بغیر دوسرے مردوں کے ساتھ پتہ نہیں کہاں کہاں کی سیاحت فرما رہی ہیں''

''یہ تو آپ براہ راست ہماری توہین کر رہے ہیں'' دونوں بیگمات ایک ساتھ بولیں۔

''خواتین کے حقوق کی چیمپئن ایک عورت کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔اس نے اپنے جسم کو زینہ بنایا اور ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ جب عمر ڈھل گئی تو اعلیٰ افسران کو لڑکیاں سپلائی کرنے لگی۔ بڑی معروف عورت ہے۔عورتوں کے حقوق کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں مزید بیٹھنا نہیں چاہئے'' انکل انیس یہ کہہ کر غصے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔دونوں بیگمات بھی جلالی شان کے ساتھ اٹھ گئیں۔

''انکل انیس! یہ سیدھی سادی بحث تھی لیکن آپ ناراض ہو ہی گئے ہیں تو جاتے جاتے یہ کڑوا سچ بھی سن لیجئے کہ خواتین کے لئے اتنے حقوق مانگیے جتنے آپ اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کو دے سکیں۔کیا آپ اپنی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کو یہ حق دیں گے کہ وہ کسی اور انیس صاحب کے ساتھ اسی طرح دورے کریں''۔

میری بات مکمل ہو چکی تھی۔انکل انیس دونوں معزز خواتین کے ساتھ ہوٹل سے باہر جا چکے تھے۔

بیرا چار کھانوں کا جو بل لایا تھا خاصا بھاری تھا لیکن بل ادا کرتے وقت میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں نے مسز توصیف سے اس زیادتی کا تھوڑا سا بدلہ لے لیا ہے جو انہوں نے انور صاحب کے ساتھ کی تھی۔

☆☆☆



# ۲۷۵۰ سال بعد

اب آگے رُخ یہ کونسا کرتی ہے اختیار
حیدرؔ یہ منحصر ہے مری داستان پر

میں وہ اوڈیس (odysseus) ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں اس لیے مجھے اپنے کردار کے علاوہ ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے۔کئی صدیوں کے بعد جب تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے لگی ہے تو سب کچھ عین اسی طرح نہیں ہے جیسا پہلے تھا۔تاہم تاریخ کے مرکزی کردار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بڑی حد پہلے جیسے ہیں۔ واقعات کی نوعیت میں بعض بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں اس کے باوجود واقعات کا انجام بہر حال پہلے سے کہیں بہتر ہونے کی امید ہے۔

اس بار ٹرائے کے بادشاہ Prime کے بیٹے شہزادہ پیرس نے مینی لئیس (MENELAUS) کی بیوی ہیلن کو اغوا نہیں کیا اس لئے ایگا میمنن (AGAMEMANON) کو دس سال تک ٹرائے کا محاصرہ کر کے بھائی کی اہانت کا انتقام لینے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔لیکن المیہ یہ ہے کہ اس کی بیوی کلائی ٹمنسٹرا (CLYTAEMNESTRA) سے اس کے شدید اختلاف پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ اختلافات بڑی حد تک اجستھس (AEGISTHUS) کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ تاہم اس بار وہ ایگا میمنن کو قتل کرانے کی بجائے اس سے باضابطہ طلاق حاصل کر کے

اِجستھس سے شادی کر لیتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی ہے لیکن کلائی ٹمنسٹرا کا کہنا ہے کہ اس نے کوئی جرم یا گناہ نہیں کیا۔ جب اگامیمنن سے نباہ نہیں ہو سکا تو اس سے علیحدگی اختیار کر کے کسی بہتر جگہ شادی کر لینا اس کا حق تھا۔ سو اس نے قانون کے دائرے کے اندر رہ کر قانونی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنا حق استعمال کیا ہے۔ اس بار میری بیوی پینی لوپی (PENELOPE) رشتے میں کلائی ٹمنسٹرا کی سگی اور بڑی بہن ہے حسن و سیرت، شوہر پرستی، عفت و عصمت اور وفا پرستی کے سارے اوصاف پہلے کی طرح اب بھی اس میں موجود ہیں۔

سمندری دیوتا پوسی ڈان (POSEIDON) اس بار خود مصیبت میں گھرا ہوا ہے۔ دراصل اس نے سمندر کی بعض بڑی مچھلیوں اور مگرمچھوں کو حد سے زیادہ اختیارات دے کر سر چڑھا دیا تھا۔ اس سے بعض ایسی خرابیاں پیدا ہوئیں کہ بعض بادشاہ بھی سمندری دیوتا کے مخالف ہو گئے اور اسے اپنے مرکز سے فرار ہو کر ایک محفوظ جگہ جا کر پناہ گزین ہونا پڑا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی بعض قوتوں کے زور سے سمندر پر اپنا اثر و رسوخ قائم رکھا ہے البتہ اس کی غیر موجودگی کے باعث اس کی سر پر چڑھائی ہوئی بڑی مچھلیوں اور مگرمچھوں کو مزید کھُل کھیلنے کا موقعہ مل گیا ہے۔

میں سمندری دیوتا کی صلاحیتوں، بالخصوص سیاسی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ شاید میرے دل میں کہیں ابھی بھی اس کے لئے تھوڑی بہت محبت کے جذبات موجود ہوں۔ پوسی ڈان کے دادا سے تو میں اب بھی متاثر ہوں۔ سمندری دیوتا سے میرے اختلاف کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ میں بڑی مچھلیوں اور مگرمچھوں کے بے جا اختیارات اور ظالمانہ اقدامات کی مذمت کرتا ہوں۔ جبکہ سمندری دیوتا کا خیال ہے کہ اسکے مقرر کردہ مشیروں کی مذمت کرنا خود دیوتا کی مذمت کرنے کے مترادف ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سمندر کی گہرائی اور وسعت کے احساس کے باوجود میرا خیال ہے کہ سورج، سمندر سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ اسی لئے میں سمندری دیوتا کے مقابلہ میں سورج دیوتا کو کہیں زیادہ عظیم سمجھتا ہوں۔

بس ایسے اختلافات کی بنیاد پر سمندری دیوتا میرا مخالف ہو گیا ہے۔ اس نے سمندری بلاؤں کو حکم دیا کہ مجھے ہلاک کر دیں۔ سمندر کی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ تو مجھ پر پہلے ہی اُدھار کھائے



بیٹھے تھے۔ حکم ملتے ہی مجھے ہلاک کرنے کے لئے لپکے۔ ان کے بڑے بڑے اور ہولناک جبڑوں سے پھسل کر میں ایک نوالے کی طرح ان کے حلق میں اتر جاتا لیکن شدید غصے کے باعث وہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور مجھے چبا چبا کر کھانا چاہتے تھے۔ شاید ان کے ذہن میں یہ خوف ہو کہ اگر مجھے سالم نگل لیا گیا تو ہوسکتا ہے یونس نبی کی طرح میں پھر زندہ نکل آؤں۔ یوں بھی انہیں نہ صرف میری ذاتی مظلومیت اور سچائی کا اندر ہی اندر احساس تھا بلکہ اپنی بعض ظالمانہ حرکات کا قدرتی ردِعمل بھی وہ دیکھ چکے تھے لیکن بجائے شرمندہ ہونے کے میرے خلاف ان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بہر حال مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھانے کے شوق میں ان کا وار نا کام ہوا اور میں بحفاظت سمندر میں سے نکل آیا۔

اسی دوران سمندری دیوتا کی طرف سے اور اس کے متعدد پجاریوں کی طرف سے پینی لوپی کو پیار، محبت کے ساتھ یہ احساس دلانے کی کوشش کی گئی کہ چونکہ میں سمندری دیوتا کا باغی اور دھتکارا ہوا ہوں اس لئے وہ مجھ سے علیحدگی اختیار کر لے۔ اس بار ستم ظریفی یہ ہے کہ پینی لوپی خود سمندری دیوتا سے گہری عقیدت رکھتی ہے۔ اس کے خاندان کے سارے لوگ سمندری دیوتا کے پجاری ہیں۔ تاہم پینی لوپی نے اس ساری صورت حال کے باوجود بڑی حکمت اور دانشمندی کے ساتھ اپنے اوڈیسس سے علیحدگی کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ اس دوران تماشہ یہ ہوا کہ جن پجاریوں نے پینی لوپی کو مجھ سے علیحدگی کا مشورہ دیا تھا ان سب کے اپنے بیٹوں، بیٹیوں کے گھر اُجڑنے لگے۔ تب سمندری دیوتا نے غضب ناک ہو کر میرے خلاف فرمانِ عام جاری کیا لیکن اس فرمانِ عام کے جاری ہونے کے دو ماہ کے اندر سمندر کے بعض حصوں میں ایسا شدید طوفان آیا کہ سمندر کی پوری تاریخ میں کبھی ایسی تباہی نہیں مچی۔ سمندر کا ایک چھوٹا سا حصہ اسکندریہ تو بالکل ہی برباد ہو گیا۔ تب سمندری دیوتا مزید غضبناک ہوا اور اس نے اپنی قوت کے زور سے میری سلطنت اتھاکا کو اٹھایا اور اسے سات سمندر پار پہنچا دیا۔

پچھلی دفعہ میں رستہ بھٹک گیا تھا اور مجھے اتھاکا پہنچنے میں دس سال لگ گئے تھے۔ اس بار اتھاکا کو مجھ سے دور کر دیا گیا ہے۔ بظاہر سات سمندر پار کرنے کے لئے مجھے سمندری دیوتا کی

خوشنودی حاصل کرلینی چاہیے لیکن میں جانتا ہوں کہ اب ہوائی جہاز کے ذریعے سات سمندر پار کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔اس دوران اگر سمندری دیوتا نے اپنے سیاسی اور سازشی ذہن سے کام لے کر کہیں مجھے مزید الجھانے یا بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو میں نے بھی ڈپلومیٹک رویہ اختیار کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔یوں بھی کسی کو بلیک میل کر کے جھکانے والوں کی انا کی تسکین تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔

پچھلے دنوں پھر سمندری دیوتا کے ایک بے حد اہم پجاری سے اطلاع ملی تھی کہ پینی لوپی کو مجھ سے علیحدگی کا مشورہ دینے کے لئے پھر ایک مشورت ہو رہی ہے۔لیکن یہ مشورہ جاری کرنے سے پہلے خود سمندری دیوتا کی بیوی کی موت واقع ہو گئی۔میرا خیال ہے پوسی ڈان کو اب کائنات کے سب سے بڑے مالک کے نظام کی کچھ کچھ سمجھ آجانی چاہئے۔یوں بھی جس قسم کا وہ دیوتا ہے اس سے ملتی جلتی قوتیں تو خود میرے اندر بھی موجود ہیں۔بہر حال مجھے اب سمندری دیوتا کا کوئی ڈر نہیں لیکن نئے زمانے کی بادشاہتوں نے اپنے اپنے قانون بنا رکھے ہیں۔ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں جانے کے لئے قانونی مرحلوں کو طے کرنا ضروری ہے۔میرے نزدیک یہ انوکھے اور بے جا قوانین ہیں،تاہم مجھے اتھاکا پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔پچھلی بار میں دس سال بھٹکنے کے بعد اتھاکا پہنچا تھا،اس بار مجھے علم ہے کہ میں اس مدت سے کہیں پہلے اپنے اتھاکا پہنچ جاؤں گا۔لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے،میں وہ اوڈیسس ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں۔اس لئے مجھے ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے ہومر کے برعکس میری پریشانی یہ ہے کہ میری دونوں آنکھیں سلامت ہیں۔اور مجھے کسی بادشاہ سے انعام واکرام بھی نہیں لینا ہے۔آنکھیں کھلی ہوں تو ''دیکھنے'' کا عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔مجھے ابھی یہ عذاب جھیلنا ہے پھر اسے رقم کرنا ہے۔مجھے اندازہ ہے کہ اس کے بعد ایک قیامت ٹوٹ پڑے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ اسی قیامت میں کوئی طوفانی لہر یا شدید تھپیڑا مجھے اتھاکا پہنچا دے گا جہاں میرے عوام کے علاوہ میری پینی لوپی بھی شدت سے میرا انتظار کر رہی ہے۔

تاریخ اپنے آپ کو دُہراتے ہوئے اپنے منطقی انجام کے مرحلوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔



بے سروسامانی اور غیر یقینی حالات کے باوجود مجھے اب کوئی تشویش نہیں ہے،میں پیش آمدہ صورت حال کو اور تاریخ کے نتائج کو اب بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں ایسے دیوتاؤں یا ان کے ایسے پجاریوں کی طرح نہیں ہوں جنہوں نے تاریخ سے کبھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔

☆☆☆

# بھید

بھید اپنے فقط ہمیں جانیں
اپنے منکر نکیر بھی ہم ہیں

میرے بچپن میں ہی میرے اباجی نے ایک طرح سے میرے دل میں اس کا شوق پیدا کیا تھا۔ وہ مجھے قصّے، کہانیاں سنانے کی بجائے بزرگانِ دین کے حالات و واقعات دلچسپ پیرائے میں سناتے۔ ایسے واقعات میں بہت سی باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتی تھیں لیکن انہیں سننے میں انوکھا سا مزہ ضرور آتا تھا۔ ایک دفعہ اباجی نے اپنے مرشد کی جڑواں بہن کے بچپن کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ سنایا:

''جنت بی بی بڑی اللہ والی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ اس نے خواب دیکھا کہ وہ سمندر کے کنارے کھڑی ہے۔ سمندر کی لہریں اس کی ٹانگوں تک آ آ کر لوٹ جاتی ہیں۔ بیدار ہونے پر جنت بی بی نے اپنی ماں کو اپنا خواب سنایا۔ ماں اس خواب کو سن کر بے حد حیران ہوئی کیونکہ جنت بی بی کی شلوار بھی گیلی تھی۔''

میں نے اباجی کی بات سن کر بچپنے کی معصومانہ ہنسی کے ساتھ کہا: ''نیند میں ان کی پِشی نکل گئی ہوگی۔''

اباجی میری بات سن کر بے ساختہ مسکرا دئے۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ جنت بی بی کی شلوار



صرف گیلی ہی نہیں تھی۔ اس پر سمندر کی ریت بھی چپکی ہوئی تھی۔ اس واقعہ کی پراسراریت نے میرے دل میں یہ شوق پیدا کیا کہ میرے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ پیش آئے۔ بڑا ہوا تو کئی کہانیوں میں اس انداز کے فرضی قصے پڑھے لیکن میری خواہش تو ذاتی تجربے کی تھی۔ اس خواہش کے دوران مجھے دو بزرگوں کے ایسے روحانی تجربات پڑھنے کا موقعہ ملا:

حضرت ابوعبداللہ جلا رحمت اللہ علیہ مدینہ منورہ میں قیام فرماتے تھے۔ وہاں انہیں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ جب بھوک سے بے حال ہو گئے تو روضۂ نبویؐ پر حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں فاقے سے ہوں اور آپ کے ہاں مہمان ہوں۔ اپنی عرض کے بعد نڈھال ہو کر سو گئے تو دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اور اپنے دستِ مبارک سے آپ کو ایک روٹی عنایت فرمائی ہے۔ آپ نے آدھی روٹی کھالی جب نیند سے جاگے تو باقی آدھی روٹی آپ کے ہاتھ میں موجود تھی۔

دوسرا واقعہ حضرت حسن بصریؒ کا تھا:

شمعون نامی ایک ستر سالہ غیر مسلم نے آپ سے کہا میری ساری زندگی تو کفر و ضلالت میں بسر ہوگئی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا اب مسلمان ہو جاؤ۔ شمعون نے کہا اگر آپ لکھ دیں کہ خدا مجھے عذاب نہیں دے گا تو میں ایمان لے آتا ہوں۔ آپ نے خط لکھ دیا۔ تب شمعون نے کہا کہ اس پر بصرہ کے معتبر افراد کی گواہی بھی کرا دیں۔ چنانچہ گواہی کرا کے خط شمعون کو دے دیا گیا۔ شمعون مسلمان ہوگیا اور اس نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو یہ خط میرے ہاتھ میں دے کر مجھے دفن کیا جائے۔ جب شمعون فوت ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق خط اس کے ہاتھ میں رکھ کر اس کی تدفین کر دی گئی۔ اُس رات حضرت حسن بصریؒ

سخت اضطراب کی حالت میں تھے۔ بار بار یہ خیال آئے کہ مجھے اپنی بخشش ہونے کا علم نہیں تو کسی اور کی بخشش کا خط کیوں لکھ دیا۔ اسی تشویش کے دوران آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھتے ہیں شمعون جنت میں پہنچا ہوا ہے اور حضرت حسن بصریؒ سے کہتا ہے میرے مولا نے ویسے ہی اتنے کرم کر دیئے ہیں کہ آپ کے خط کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس لئے اپنا یہ خط واپس لے لیں۔ حضرت حسن بصریؒ جب بیدار ہوئے تو وہ خط آپ کے ہاتھ میں موجود تھا۔

ان واقعات کو پڑھنے کے بعد بزرگانِ دین سے تمام تر عقیدت کے باوجود میں ذ ہنی شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گیا۔ تب میں شوگر ملز میں ملازم تھا۔ دسمبر کے آخری دن تھے۔ اس شام کو میری شام چھ بجے سے رات دو بجے تک والی شفٹ تھی۔ جب میں ڈیوٹی کے لئے جا رہا تھا تو مجھے ہلکا ہلکا سا بخار ہو رہا تھا۔ میں نے لیبارٹری میں بمشکل دو گھنٹے کام کیا تھا کہ بخار تیز ہو گیا۔ اپنے معاون کو اپنی ڈیوٹی سونپ کر میں لیبارٹری کے متروک ڈارک روم میں چلا گیا۔ وہاں فلٹر کلاتھ کا صرف ایک ٹکڑا پڑا تھا جسے میں نے بچھونا بنا لیا، سرہانے ایک اینٹ رکھی اور سکڑ کر لیٹ گیا۔ جیسے جیسے بخار چڑھ رہا تھا ٹھنڈک کا احساس بڑھ رہا تھا۔ اوپر کوئی رضائی، کمبل یا چادر نہ ہونے کے باعث کپکپی ہونے لگی تھی۔ اچانک ایسے لگا جیسے کسی نے آ کر میرے اوپر رضائی ڈال دی ہو اور پھر مجھے گہری نیند آ گئی۔ رات ڈیڑھ بجے جب چھٹی کا پہلا سائرن بجا تو میری آنکھ کھل گئی۔ میرا جسم پسینے سے بھرا ہوا تھا، بخار ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے اپنے اوپر پڑی ہوئی رضائی کو ایک طرف کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر یہ کیا؟ ڈارک روم میں کسی رضائی کا نام ونشان نہ تھا۔ یہ کیا بھید تھا؟ میں خوشی اور حیرت سے مغلوب ہو گیا۔ میں نے اپنی یہ واردات سارے عزیزوں اور دوستوں کو سنائی۔ کسی نے مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھا اور کسی نے اسے میرا وہم قرار دیا۔ ابا جی نے کہا کہ جو کچھ ہوا تھا اسے اپنے تک رکھنا تھا۔ تم اس اسرار کو برداشت نہیں کر سکے اس لئے اب آئندہ ایسے تجربے کی لذّت سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ اور واقعی میں ایسے تجربے کی لذت سے محروم ہو گیا لیکن



روحانیت سے میرا لگاؤ بڑھ گیا۔ میرے شکوک وشبہات ختم ہو گئے۔ میں نے اولیائے کرام کی زندگیوں میں ایسے تجربات کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا کہ ان کے مطالعہ کی بھی اپنی ایک لذت تھی۔

☆☆

پہلے تجربے کے پورے بیس سال بعد کل رات پھر ایک انوکھی واردات ہو گئی ہے۔ مجھے ایک ہفتہ سے انفیکشن کی شکایت تھی۔ جب گلا بالکل بیٹھ گیا تب ڈاکٹر کے پاس گیا۔ پہلے تو ڈاکٹر نے بیماری کے ایک ہفتہ بعد آنے پر سرزنش کی پھر پنسیلین کی گولیاں دیں۔ اس نے کہا کہ پورے سات دن تک صبح، دوپہر، شام باقاعدگی سے ان کے استعمال سے آرام آ جانے کی امید ہے لیکن ان سات دنوں میں ایک وقت کی بھی بے قاعدگی نہ ہو۔ ڈاکٹر کی اتنی تاکید کے باوجود پہلے ہی دن میں شام کی گولی کھانا بھول گیا۔ کچھ دن بھر کی تھکن تھی کچھ سستی۔ اٹھنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ بار بار ارادہ کرتا کہ ابھی اٹھ کر گولی لے لیتا ہوں لیکن نیند مجھ پر حاوی ہوتی گئی۔ پھر یوں لگا جیسے کسی نے کیپسول نما پینسلین کی موٹی سی گولی میرے منہ میں ڈال دی ہے، میں بغیر پانی کے اسے نگلنے کی کوشش کر رہا ہوں اور بالآخر نگل گیا ہوں۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو اس تجربہ کی حیرت اور خوشی میرے انگ انگ میں بھری ہوئی تھی۔ پورے بیس سال بعد میں نے کائنات کے عظیم تر اسرار کو یا شاید اس کی پرچھائیں کو پھر ہلکا سا چھوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری پینسلین کی گولیوں میں سے ایک گولی ضرور کم ہو گی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ گولیوں کو چیک کیا تو کوئی گولی کم نہیں تھی۔ اتنی ہی گولیاں تھیں جتنی رات کو سونے سے پہلے موجود تھیں۔ میری حیرت اور خوشی کچھ بجھنے لگی لیکن ایک دم جیسے ان کی روشنی پہلے سے بڑھ گئی۔ گولیاں بے شک جوں کی توں موجود تھیں لیکن میرا اسرار بھرا تجربہ بھی سچ تھا۔ ڈاکٹر نے جس انفیکشن کے خاتمہ کے لئے سات دن کی میعاد بتائی تھی وہ پہلے ہی دن ختم ہو چکی تھی۔ میرا گلا بالکل ٹھیک تھا۔ کہیں ہلکی سی خراش کا احساس بھی نہیں تھا۔ میں نے زور سے آواز دے کر اپنی بیوی کو بلایا اور اسے اپنے رات کے تجربہ کے بارے میں بتانے لگا۔ اس دوران میرے بچے بھی آ گئے تھے اور اور میرے قصے کو دلچسپی سے سن رہے تھے۔

جب میں اپنا تجربہ بیان کر چکا تب مجھے یاد آیا کہ مجھے تو اس بھید کو صرف اپنے تک رکھنا چاہئے تھا۔ اب مجھے اگلے تجربے کے لئے پھر بیس سال انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن میں اب ۴۴ سال کا ہو چکا ہوں اور ۶۳ سال سے آگے جانے کی تو خواہش ہی نہیں رکھتا۔ اس کا مطلب ہے اب میں کسی اور روحانی تجربے سے آشنا نہ ہوسکوں گا۔

لیکن میں ۶۳ سال سے آگے جینے کی خواہش کیوں نہیں رکھتا؟

یہ بھی ایک بھید ہے، اور یہ بھید تو اب میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا۔

☆☆☆



# اعتراف

شہرِ جاں کی دیکھ کر یخ بستگی
خواہشیں تک ہم جلانے لگ گئے

آج میں آپ کو کوئی کہانی نہیں سناؤں گا۔ آج تو مجھے اپنی ایک اُلجھن کے بارے میں بتانا ہے۔ یہ اُلجھن کچھ اتنی زیادہ الجھی ہوئی بھی نہیں ہے۔ بڑی سیدھی سادی سی الجھن ہے۔ مجھے بچپن سے ہی مکھیوں کو دیکھ کر وحشت ہوتی۔ اب سوچتا ہوں ممکن ہے بچپن میں مجھے کس چھوٹی سی شہد کی مکھی نے کاٹ لیا ہو اور میں اسے بھی عام سی مکھی سمجھ کر مکھیوں سے الرجک ہونے لگ گیا۔ لڑکپن تک پہنچا تو میں نے دیکھا میرے کئی ہم عمر میز پر، کرسی کی ہتھی پر یا دیوار پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کو بآسانی مار لیتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی کئی بار دوستانہ ترغیب دی لیکن میں مکھی مارنے کے لئے کبھی بھی آمادہ نہ ہوسکا۔ میں نہیں کہہ سکتا میں مکھیوں سے خوفزدہ تھا یا مجھے ان سے کراہت محسوس ہوتی تھی یا میری الجھن کی کوئی اور وجہ تھی۔ میرے مسلسل انکار کے باعث میرے دوستوں نے مجھے بزدلی کا طعنہ دینا شروع کر دیا حالانکہ مکھی مارنا کہاں کی بہادری تھی کہ مجھے بزدل قرار دیا جاتا۔ اس کے باوجود میں نے کئی بار کوشش کی۔ چھپ چھپا کر کوشش کی کہ ایک آدھ دفعہ کسی مکھی کو مارلوں تاکہ اس معاملے میں جھجک یا خوف جو کچھ بھی ہے کسی حد تک دور ہو جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ میرے ہم عمروں نے میرے بارے میں یہ جملہ گھڑ لیا ''یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا''۔ جواباً میں نے

انہیں مکھی مار کہنا تو شروع کر دیا لیکن اندر ہی اندر میری الجھن اور وحشت بڑھتی گئی۔ ''یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا'' یہ جملہ کسی گرز کی طرح مجھ پر برستا اور میں اندر ہی اندر ٹوٹنے لگتا اور پھر اپنی الجھن اور دوستوں کے طعنوں کے باعث میں نے بہادری کے متبادل تلاش کرنا شروع کر دیئے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے میں نے تیرہ برس کی عمر میں جنس کے میدان میں پہلی فتح حاصل کر لی تھیں۔ میں اپنی جرأت اور بہادری پر خود ہی حیران بھی تھا اور نازاں بھی۔

لڑکپن میں پھر کئی چھوٹی چھوٹی فتوحات حاصل کیں۔ یہاں تک کہ میرے ہم عمروں کو بھی ان کی کچھ کچھ بھنک سی پڑنے لگی لیکن انہوں نے یہ کہنا نہیں چھوڑا کہ یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا۔ ویسے ان کے لہجے سے اب طنز کی بجائے حسد کا اظہار ہونے لگا تھا اور ان کا یہی حسد مجھے جیسے اپنے طاقتور ہونے کا احساس دلانے لگا تھا۔ جوانی تک پہنچا تو میں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ بھر پور جوانی تک میں اپنے میدان کا اسکندر اعظم بن چکا تھا جو اپنے دائرہ کار میں آدھی سے زیادہ دنیا فتح کر چکا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کو پلٹ کر دیکھا میرے سارے ہم عمر دوست بہت پیچھے رہ گئے تھے سوائے دو دوستوں کے۔ ایک جو شاعر تھا اور لندن میں کسی میم سے شادی کر کے وہیں آباد ہو گیا تھا۔ دوسرا حمید۔ حمید میرا ہم رکاب تھا لیکن کسی ایسے جانور کی طرح جو شیر کے شکار کا ''جوٹھا'' ملنے کی امید میں حریص نظریں گاڑے بیٹھا ہو۔ لیکن اس شیر کے اپنے کچھ اصول تھے۔ چنانچہ حمید جب مجھ سے بالکل مایوس ہو گیا تو وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ جب وہ جانے لگا تو مجھے ایسے لگا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا ہو تم کہاں کے اسکندر اعظم ہو۔ تم تو مکھی بھی نہیں مار سکتے۔ اور میں اندر ہی اندر مزید ٹوٹنے لگا۔

میں نے ادھیڑ عمری میں بھی جوانی کے مزے لوٹے ہیں لیکن بڑھاپے میں اپنی باگیں اپنی بیوی کے ہاتھ میں تھما دیں۔ جنس کے معاملے میں میرے اپنے اصول ہیں۔ کسی سے زبردستی ظلم ہے لیکن اگر میاں بیوی راضی ہوں تو قاضی کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ قاضی زیادہ مداخلت کرے تو بھگوان کو ساکھشی مان کر کام چلا لیجئے۔ اس طرح قاضی سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے ہمیشہ دوستی بڑھا کر اور اپنی دوست کو رضامندی سے بھی آگے راضی بہ رضا کے



مقام پر لا کر جھک ماری ہے۔ کبھی کسی سے کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ دھوکہ نہیں دیا۔ دو قدم کا ساتھ ہے، عمر بھر کا نہیں ہے۔ اصل میں جھوٹ، دھوکہ دہی، بلیک میلنگ، فریب کاری یہ سارے جوہر تو آج کے زمانے میں اخلاقیات اور سیاست کے نمبرداروں نے اپنا رکھے ہیں۔ بہر حال میری صاف گوئی یا حماقت کا اندازہ اسی بات سے کر لیں کہ میں نے اپنی بیوی سے اپنی کوئی فتح پوشیدہ نہیں رکھی حالانکہ ایسے معاملات کا بھلے ساری دنیا کو علم ہو جائے صرف بیوی کو علم نہیں ہونا چاہئے۔

مجھے اپنی ساری زندگی میں صرف دو دفعہ شدید پچھتاوا ہوا ہے۔ ایک دفعہ تب ہوا جب میرے بچپن کے دوست اور لندن میں مقیم شاعر کی میم بیوی میرے پیچھے پڑ گئی۔ اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ تمہارا دوست جنسی لحاظ سے ناکارہ ہو گیا ہے اور اب نوجوان لڑکوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنا objective گزارا کر رہا ہے۔ اس وقت پتہ نہیں کیوں مجھے دوست کا لحاظ مار گیا۔ میں نے اپنی جھولی میں خود بخود آ کر گرنے والے پھل کو اٹھا کر اپنے دوست کی فرج میں رکھ دیا۔ اپنی اس شرافت پر میں آج بھی شرمندہ ہوں۔ مجھے اس میم کو مایوس نہیں کرنا چاہئے تھا۔ دوسری دفعہ مجھے اس وقت پچھتاوا ہوا جب لاہور کی ایک بُری عورت کی خواہش میں نے پوری کر دی۔ مجھے اس عورت کی صورت کسی مکھی کی طرح لگنے لگی ہے اسی لئے میرے پچھتاوے میں کراہت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے یہ باتیں بھی اپنی بیوی کو بتا دی تھیں۔

بیوی سے یاد آیا۔ میرے نانا جی اور تایا جی کو بڑھاپے میں نئی بیوی لانے کا بہت شوق تھا۔ ان بے چاروں کے شوق تو پورے نہ ہوئے البتہ بڑے ماموں نے ستر سال کی حد پار کرنے کے بعد بھی بازی جیت لی۔ لوگوں نے بہت بکواس کی۔ ان کے بڑے بیٹے کی بیوی نے کئی برس پہلے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ لوگوں نے اسے ہی جواز بنا لیا: وہ بے چارہ ابھی تک دوسری شادی نہیں کر سکا اور اس بوڑھے کو دیکھو بیٹے کا رشتہ کرانے کی بجائے خود شادی رچا بیٹھا۔ مولوی، مولوی ہی ہوتا ہے چاہے کسی مسلک کا ہو۔ اپنی بیٹی کی ہم عمر عورت سے شادی رچا بیٹھا ہے اور اب دین سے اس کی سند اور جواز پیش کر رہا ہے۔ ارے ایک بیٹی بھی تو بیوہ ہے اس کی۔ اگر دین کا اتنا ہی پاس تھا تو پہلے اپنی بیوہ بیٹی کا کہیں رشتہ کراتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ پر مجھے اپنے ماموں کی یہی

ایک خوبی تو بھائی تھی۔بہتر سال کی عمر میں شادی۔جیئو بڑے ماموں زندہ باد!

صاحبان!۔۔۔۔۔۔اس وقت میں اسی برس سے اوپر کا ہو گیا ہوں۔اب اس عمر میں کہاں تک جھوٹ بولوں لیجئے آپ کو سچی بات بتا ہی دوں۔حمید نامی کوئی شخص کبھی بھی میرا دوست نہیں رہا۔میرے اندر ساٹھ سال تک تو بہر حال جنس کا طوفان سا مچا رہا لیکن یہ طوفان کبھی بھی کناروں سے باہر نہیں آیا۔میری فطرتی بزدلی نے میرے کناروں کو بہت بڑے بند میں تبدیل کر دیا تھا۔میری جنسی فتوحات کی ساری کہانیاں میری خواہشات کا لفظی بیان تھیں اور بس۔اس لفظی بیان کی جادوگری کام کرتی رہی۔مجھے بزدل کہنے والے مجھے حسد بھری نظروں سے دیکھتے اور جل کر من ہی من میں کہہ دیتے ہو نہ ہو یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا۔اب وہ سارے دوست مر کھپ چکے ہیں تو پھر مزید جھوٹ بولنے سے فائدہ؟ یوں بھی جنس کا طوفان تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔اب تو میرے اندر اور باہر برف ہی برف ہے۔(پر یہ ''خواہش'' ابھی تک کیوں نہیں مری؟)

ابھی ابھی ایک انوکھی بات ہو گئی ہے۔ہلکی سی دھپ کی آواز کے ساتھ دو جُڑی ہوئی مکھیاں میرے میز پر آن گری ہیں۔ان کے ''طرزِ عمل'' سے مجھے علم ہو گیا ہے کہ ایک نر ہے اور ایک مادہ۔میں نے کسی وحشت یا کراہت کے بغیر انہیں دلچسپی سے دیکھا ہے۔کاش میرے سارے بچپن کے دوست اس وقت زندہ ہوتے اور یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

میں نے اخبار اٹھا کر اسے تھوڑا سا فولڈ کیا ہے اور اس کے ایک ہی وار سے نر اور مادہ دونوں مکھیوں کو ''دورانِ عمل'' ہی ختم کر دیا ہے۔

☆☆☆



# بابا جمالی شاہ کا جلال

وادیٔ حیرت میں حیدؔر دیکھ لو
سارے فرزانے ٹھکانے لگ گئے

جو کچھ جیلے کے ساتھ ہو گیا ہے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!

لیکن اس کی ساری ذمہ داری خود اس پر اور اس کے سخت دل مولوی باپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

مولوی عطاء الرحیم پہلے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔وہاں کی چھوٹی سی مسجد میں نمازیں پڑھاتے، گاؤں والوں کو خدا، رسولؐ کی باتیں سناتے۔گاؤں والوں کو ان کی باتیں سمجھ میں آتیں یا نہ آتیں لیکن سارے لوگ ان کی بہت عزت کرتے۔حالات نے پلٹا کھایا تو وہ گاؤں سے شہر آ گئے۔یہاں ترقی کرتے کرتے وہ شہر کی جامع مسجد کے امام بن گئے۔دیکھتے ہی دیکھتے پہلے موٹر سائیکل، پھر کار اور آخر کار پجارو کے مالک بن گئے۔اب اُن کا رعب دبدبہ بھی بہت ہو گیا تھا۔ہر شعبۂ حیات کے لوگ اُن کی خوشامد کرتے۔ان کے آگے آنکھیں بچھاتے چلے جاتے۔لوگوں کی خوشامد اور دولت کی ریل پیل نے انہیں وسیع المشرب اور راسخ العقیدہ عالم کی جگہ متعصّب اور کٹّر پن کا شکار مولوی بنا دیا تھا۔

اب مجھے احسااس ہو رہا ہے کہ جیلے کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں شاید تھوڑا سا میرا بھی قصور ہے۔میں نے ایک دفعہ اسے ایک مجذوب کا قصّہ سنایا تھا۔مغلیہ دور میں جب ایک اہم

مغل بادشاہ کی تیار کرائی ہوئی عالی شان مسجد میں پہلی نماز ہونے لگی تو ایک مجذوب بھی نماز کے مقتدیوں میں شامل ہو گیا۔ مغلوں کے مقرر کردہ امام نے نماز شروع کی تو اُس مجذوب نے بلند آواز میں کہا: جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے۔ مغل بادشاہ، ان کے سرکاری امام اور سارے درباریوں کو مجذوب کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ نماز کے بعد اس مجذوب کو ڈانٹا گیا تو اُس نے بڑی سادگی سے کہا میرے قدموں کے نیچے کی زمین کھود کر دیکھ لو، میں نے جو کچھ کہا ہے، سچ کہا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے اسی وقت وہاں کھدائی کی گئی تو ایک تھیلی برآمد ہوئی جس میں سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔ سب لوگ اس واقعہ پر ابھی حیران ہی تھے کہ اس مجذوب نے کہا:

''نماز شروع کرتے ہی امام نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ شاہی مسجد کی پہلی نماز پڑھا رہا ہوں۔ ظلِ الٰہی بہ نفسِ نفیس حاضر ہیں۔ کم سے کم سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تو ضرور انعام میں عطا کریں گے۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے۔''

جب میں نے جیلے کو یہ قصہ سنایا تھا، اس کی آنکھوں میں معصومانہ حیرت تھی۔ پھر وہ مجھ سے وقتاً فوقتاً صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے حالات پوچھتا اور سنتا رہتا۔ پھر کہیں ایک دن اس نے اپنے باپ مولوی عطاالرحیم کے سامنے بھی چند قصے دہرائے تو مولوی عطاالرحیم بھڑک اٹھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کا بیٹا اس حد تک ''گمراہ'' ہو چکا ہے۔ انہوں نے بڑی مہارت سے جیلے کو کنٹرول کیا۔ چنانچہ ایک مختصر سے وقفہ کے بعد میری جیلے سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنے مولوی باپ کے عطا کردہ علم کے باعث اپنی معصومیت اور حیرت کھو چکا تھا۔ اب وہ مجھے بتا رہا تھا کہ یہ سب مجذوب فقیر ڈھونگی ہوتے ہیں۔ اولیاء کو مجذوبوں کے ساتھ نہیں ملانا چاہئے۔ پھر وہ مجھے تصوف کی تعریف اور اس کے بعض مراحل کی بابت بتانے لگا جو ظاہر ہے مولوی عطاالرحیم نے اپنے کچے پکے علم کی بنیاد پر اسے رٹا دیا تھا۔ میں نے اسے توجہ دلائی کہ تصوف کے بارے میں جاننا اور صوفیانہ تجربے سے گزرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن میری بات اب جیلے کی نظر میں ہیچ نہیں رہی تھی۔ الٹا وہ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ مغلیہ دور کے امام سے الجھنے والا مجذوب دراصل ملحد



تھا۔ پورا کلمہ نہیں پڑھتا تھا اسی لئے اسے قرآن و سنت کی روشنی میں قتل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ اس مجذوب کی شہادت میں مذکورہ امام کی سازش شامل تھی جس نے اپنی سبکی کا بدلہ لینے کے لئے مذہبی عقائد کا ڈرامہ کیا تھا۔ بس اسے اتنی نصیحت کر دی کہ وہ کسی بھی مسلک پر کاربند رہے لیکن کبھی کسی مجذوب فقیر سے نہ الجھے۔

☆☆

بابا جمالی شاہ شہر کے درمیان میں واقع قبرستان میں ہی اکثر دیکھے جاتے تھے۔ کبھی کبھار شہر کی سڑکوں پر بھی اپنی دُھن میں جاتے نظر آ جاتے تھے۔ کسی کی دعا کی درخواست قبول کرنا ان کے موڈ پر منحصر تھا لیکن جس کی دعا کی درخواست قبول کرتے فوراً 'ہاں' یا 'نہ' میں جواب دے دیتے تھے۔ خود میں نے اپنے دسویں کے امتحان کے بعد ان سے کہا تھا کہ جمالی بابا دعا کریں میں دسویں میں پاس ہو جاؤں۔ انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ ان کے بے آواز ہونٹ تھوڑی دیر کے لئے ہلے، جیسے خدا سے دعا کر رہے ہوں پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا: جا بچہ۔ تو پاس ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے خیال آ گیا کہ فرسٹ ڈویژن بھی مانگ لوں۔ چنانچہ میں نے جمالی بابا سے پھر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کی دعا کے لئے بھی کہہ دیا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا پھر اُسی طرح بے آواز ہونٹ ہلانے لگے۔ جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ان میں مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگے یہ دعا بھی پوری ہوئی۔ قدرت خدا کی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ تاہم کسی کی دعا کی درخواست سننا بابا جمالی شاہ کی مرضی پر منحصر تھا۔ عموماً وہ بڑے لوگوں کی درخواست پر دھیان نہیں دیتے تھے۔

ایک بار علاقے میں بارشیں نہیں ہوئیں۔ فصلوں کے نقصان اور قحط کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ تب مولوی عطاءالرحیم نے ایک دن پہلے سارے شہر میں نماز استسقاء کے لئے اعلان کرایا اور اگلے دن بڑی عیدگاہ میں نماز استسقاء پڑھائی، لیکن بے سود۔ لگ بھگ ایک ہفتے کے بعد بعض غریب غرباء بابا جمالی شاہ کے پاس بارش کی دعا کرانے کے لئے گئے۔ بابا جمالی شاہ نے اپنے معمول کے مطابق آنکھیں نہیں موندیں۔ مزاروں سے کھجور کی چند چھڑیاں اٹھائیں اور سڑک پر آ گئے۔ انہوں

نے وہ چھڑیاں زور زور سے سڑک پر مارنا شروع کر دیں۔ سڑک پر دو تین بار چھڑی مارنے کے بعد ایک بار آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتے اور پھر جیسے ڈانٹنے کے انداز میں کہتے:

:''اوئے! مینہ برساتا ہے یا نہیں؟۔ میں کہتا ہوں مینہ برساؤ''

میرا خیال ہے کہ ہر بندے کی خدا کے ساتھ تعلق کی اپنی نوعیت ہوتی ہے۔ خدا تو اندر کے سارے بھید جانتا ہے۔ وہ کسی کی عاجزی میں بھی ریاکاری کی بُو پائے اور اسے دھتکار دے اور کسی کی بے ادبی جیسی بے تکلفی میں بھی محبت کی خوشبو پائے اور اس کے ناز اٹھالے۔ بابا جمالی شاہ ساری چھڑیاں سڑک پر مار مار کر توڑ چکے تو پھر قبرستان واپس چلے گئے لیکن سارے شہر نے دیکھا کہ گھنگھور گھٹائیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں۔ پھر ایسی برسات ہوئی کہ قحط کے سارے خوف دُھل گئے۔

ویسے تو مولوی عطاء الرحیم اس واقعہ کے بعد سے ہی بابا جمالی شاہ کے سخت خلاف ہو گئے تھے لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک بار مولوی صاحب کو رات کی تاریکی میں بابا جمالی شاہ کے پاس جاتے دیکھا تھا۔ شاید مولوی صاحب نے انہیں دعا کی درخواست کی ہو اور بابا جمالی شاہ نے انہیں جواب ہی نہ دیا ہو۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد پتہ چلا کہ مولوی عطاء الرحیم کی رپورٹ پر بابا جمالی شاہ کو پڑوسی ملک کے لئے جاسوسی کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے لیکن گرفتاری کے تیسرے ہی روز پتہ چلا کہ بابا جمالی شاہ پر تشدد کرنے والا چھوٹا تھانے دار پاگل ہو گیا ہے اور تھانے کے عملہ نے خوفزدہ ہو کر بابا جمالی شاہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد مولوی عطاء الرحیم کے غیض و غضب میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ان کے اشارے پر ان کے بیٹے جیلے نے بہت سارے بچوں کو ٹافیوں کا لالچ دے کر وقتاً فوقتاً بابا جمالی شاہ پر پتھراؤ کرنے اور انہیں پاگل پاگل کہنے کی ڈیوٹی پر لگا دیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسے مجذوبوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے لیکن وہ بابا جمالی شاہ کو کوئی بہت بڑا چالباز اور مکار قرار دے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بابا جمالی شاہ مسمریزم کا عمل جانتا ہے اسی لئے تھانے والوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔



☆☆

آج بعد نماز عصر نوجوانوں کا ایک گروہ ایک جنازہ اٹھائے ہوئے بابا جمالی شاہ کے پاس پہنچا تھا۔ یہ سارے لڑکے جیلے کے دوست یا واقف کار تھے۔ میّت کے طور پر جیلا لیٹا ہوا تھا۔ ان کا پروگرام تھا کہ پہلے بابا جمالی سے کہیں گے کہ یہ ایک میّت ہے اس کا جنازہ پڑھا دیں۔ جب بابا جنازہ پڑھا دیں گے تو پھر سب مل کر بابا کا مذاق اڑائیں گے۔ اس پروگرام کا روحِ رواں جیلا تھا اسی لئے وہ خود میّت بنا پڑا تھا۔ لڑکوں نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ بابا جمالی شاہ سے کہا کہ یہ ایک میّت ہے اس کی نماز جنازہ پڑھا دیں۔ بابا نے نماز جنازہ پڑھانی شروع کر دی حالانکہ پیچھے کوئی صف بھی نہیں بنی تھی، نہ ہی کوئی اور نماز جنازہ میں شریک تھا، بابا جمالی اکیلے ہی لگے ہوئے تھے، جب انہوں نے آخری سلام پھیرا تو لڑکوں نے زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے اور کہنے لگے: بابا جمالی! یہ تو مولانا عطاء الرحیم کا بیٹا جیلا ہے اور زندہ ہے۔

تب بابا جمالی شاہ نے بڑے جلالی انداز میں کہا:

یہ جو کوئی بھی تھا اب صرف قیامت کے دن ہی اٹھے گا کیونکہ اس کا جنازہ جمالی شاہ نے پڑھا دیا ہے۔

تمام حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جیلا واقعی مر چکا تھا۔

☆☆

جو کچھ جیلے ساتھ ہو گیا ہے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!

لیکن اس کی ساری ذمہ داری خود اُس پر اُس کے سخت دل مولوی باپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

☆☆☆

# مسکراہٹ کا عکس

روشنی کا استعارہ کر لیا
دل نے ہر آنسو ستارہ کرلیا

ایک بہت بڑے فریم میں ابا جی کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگا کے میں نے فریم کو اپنے ڈرائنگ روم میں آویزاں کر رکھا ہے۔ گھر کے باقی کمروں میں بھی ان کی چھوٹی چھوٹی تصویریں سجا رکھی ہیں اور یہ ساری تصویریں میرے من میں بھی سجی ہوئی ہیں۔ گو انہیں فوت ہوئے ایک زمانہ ہو گیا ہے لیکن ان تصویروں کے باعث مجھے گھر میں ان کی موجودگی کا گمان رہتا ہے۔ ڈرائینگ روم والی بڑی تصویر اس لحاظ سے باقی ساری تصویروں سے الگ ہے کہ اس میں ابا جی کے چہرے پر ولیوں جیسی شان بے حد نمایاں ہے۔ میک اپ کر کے اپنے چہرے پرنُور ظاہر کرنے والے نام نہاد مقدس لیڈروں سے مختلف، اپنے اندر کی روشنی سے منوّر ابا جی کا چہرہ۔ اور پھر اس چہرے میں دو جگمگاتی آنکھیں۔ ان جگمگاتی آنکھوں میں عجیب اسرار ہیں۔ میں کبھی کوئی بہت اچھا اور نیکی کا کام کرتا ہوں تو ابا جی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دکھائی دیتی ہے۔ میں سب سے بچ بچا کر اور چھُپ چھپا کر بھی کوئی برا کام کر بیٹھوں تو ابا جی کی آنکھوں سے برہمی بلکہ تادیب کی لَو بھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔

کسی نے مجھ سے زیادتی کی۔۔۔ میں نے اس سے برابر کا بدلہ لے لیا۔ ابا جی کی آنکھوں کی



اداسی جیسے بولنے لگتی ہے: اس نے تمہیں دُکھ پہنچایا، برا کیا۔ تم نے فوراً بدلہ لے لیا۔ کیا مل گیا بدلہ لے کر؟ کبھی دکھ کو سہہ جانے کا مزہ بھی چکھ کر دیکھو!

بعض بھائیوں نے میرے ساتھ ہاتھ کیا، میں نے انہیں سبق سکھانا چاہا تو ابا جی کی دکھ سے بھری آنکھیں مجھے نصیحت کرنے لگیں: تم سارے بھائی میرے ہی وجود کی شناخت ہو۔ وہ چھوٹے ہیں، نادان ہیں۔ انہیں نقصان پہنچاؤ گے تو وہ بھی تمہارا نقصان ہوگا۔ تم جیتو یا ہارو، دونوں صورتوں میں خود ہی ہارو گے اور مجھے ہی ہراؤ گے۔

کبھی کبھی تو ایسے لگتا ہے جیسے میں ٹین ایج میں ہوں اور ابا جی ہمہ وقت جا، بے جا مداخلت کر کے مجھے اپنے بنائے ہوئے سیدھے رستے پر چلائے رکھنا چاہتے ہیں اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ فریم میں ابا جی کی تصویر نہیں، ایک آئینہ ہے۔ میں اس کے روبرو ہوتا ہوں تو گویا اپنے روبرو ہوتا ہوں۔ مجھ پر میرے اندر سے اچھائی اور برائی کا فرق منکشف ہونے لگتا ہے۔ نیکی اور خیر کی تحریک ملنے لگتی ہے۔

ایک بار میں نے اپنے تینوں بیٹوں کی ابا جی کے ساتھ تصویر کھینچی تھی۔ ٹیپو، ابا جی کی گود میں تھا اور زلفی، شازی اُن کے دائیں، بائیں۔ مدت کے بعد اس تصویر کو دیکھا۔ میں تصویر میں موجود نہیں تھا لیکن میں نے ہی تو تصویر کھینچی تھی۔ سواِس تصویر میں اپنی موجودگی، اپنی شرکت کا احساس جاگا۔ اپنے تینوں بیٹوں اور ابا جی کی گروپ تصویر کو دیکھ کر میں جیسے درجۂ شہود میں داخل ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے وجود میں میرے ماضی، حال اور مستقبل کے تینوں زمانے یکجا ہو گئے ہیں۔ سارا زمان ایک نقطے میں ڈھل گیا ہے۔ شاہد و مشہود کی تفریق ختم ہوگئی ہے۔ لیکن اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ابا جی مجھے روکتے، ٹوکتے کیوں رہتے ہیں؟۔ تب ہی نقطۂ زماں پھیلنے لگا اور میں اپنے لڑکپن سے جوانی کے دور میں داخل ہونے لگا۔ ہر نصیحت سے غافل اور بیگانہ۔ خواہشات کا اژدہام تھا اور میں تھا۔ میں منزلوں پر منزلیں مار رہا تھا۔ خواہشات کی نوعیت بدلتی گئی، عمر ڈھلتی گئی لیکن خواہشیں جہنم کی طرح **هل من مزيد** پکارتی رہیں۔ بے شک انسان حریص ہے کہ اسے سونے کا پہاڑ مل جائے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے ویسے ہی ایک اور پہاڑ کی خواہش

کرنے لگے گا۔ خواہش کے جہنم کا کوئی انت نہیں ہے، اس سے نکل آنے میں عافیت ہے۔ اور پھر میں اپنے گوتم کے پاس آ گیا۔ خواہشوں کے جہنم سے نکل آنے کے بعد اباجی سے ملاقات ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں بیک وقت خفگی اور خوشی کا تاثر تھا:

''خواہش پوری ہونے پر تسکین نہیں ہوتی بلکہ حرص کا روپ دھار لیتی ہے۔ جتنی خواہشیں پوری ہوتی جاتی ہیں اتنا ہی حرص بڑھتا جاتا ہے۔ یہ پیاس اور یہ آگ کبھی بھی نہیں بجھتی۔ خواہشیں بے انت سراب کی ٹھاٹھیں مارتی لہریں ہیں!''

''اباجی! میں جوگی نہیں ہوں۔ صوفی اور تیاگی نہیں ہوں۔ ان سب کی جی جان سے عزت کرتا ہوں لیکن ان جیسا بننا نہیں چاہتا، میں آپ جیسا ہی بننا چاہتا ہوں۔ زندگی کو بھوگتے ہوئے اپنی ریاضت، اپنی تپسیا مکمل کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ کے برعکس میری خواہشیں، حرص میں ڈھلنے لگتی ہیں اور میری ساری ریاضت برباد ہو جاتی ہے، ساری تپسیا بھنگ ہو جاتی ہے۔ اور اباجی! آپ نے مجھے کبھی قناعت کا درس بھی تو نہیں دیا تھا۔ شاید اسی لئے خواہشوں کو مکمل طور پر تیاگ دینا میرے لئے ممکن نہیں ہے''

یہاں تک بات کرتے کرتے میری آنکھوں کا پانی پلکوں تک آ گیا تھا۔ پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسوؤں نے سارا منظر دھند میں لپیٹ دیا تھا۔ لیکن یہ کیا؟

دراصل ہمارے اندر کی دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ باہر کی، ظاہر کی دنیا سے یہ سب کچھ الگ تھلگ ہوتا ہے۔ اپنے اندر کی دنیا میں مگن رہنے کے باوجود میں اندر اور باہر کی دنیاؤں کے اس فرق کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ اباجی کی تصویر سے میرے تعلق کی نوعیت بھی حقیقتاً داخلی تھی۔ ظاہر کی دنیا کے حساب سے تو شاید ایسا کچھ بھی نہیں تھا لیکن میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بھی پوری طرح دیکھا تھا کہ اباجی سچ مچ تصویر کے فریم سے باہر نکلے، اور صوفے پر آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ اپنی پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے۔ لیکن آنسو تو امڈتے ہی چلے آتے تھے۔ جیسے سیلاب بن کر خواہشوں کے اژدہام کو بہا لے جانا چاہتے تھے۔ تب اباجی نے بیٹھے ہی بیٹھے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا۔



شاید وہ بول نہیں سکتے تھے اور اسی طرح مجھے دلاسہ دے رہے تھے۔ پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے جانے اور اباجی کا مجھے خود سے لپٹانے کا میرا تجربہ خیالی یا روحانی قطعاً نہیں تھا۔ یہ مکمل طور پر جسمانی اور ظاہری وقوعہ تھا۔

میں نے آنکھوں کو اچھی طرح صاف کیا اور آنسوؤں کی دھند کو ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میرے تینوں بیٹے میرے پاس تھے۔ ٹیپو نے مجھے بانہوں میں بھینچ رکھا تھا، شازی میرا کندھا دبا رہا تھا سامنے زلفی کھڑا تھا اور اس کے ہاتھوں میں بھیگا ہوا رومال تھا۔

''اباجی! آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ کو بیٹھے بیٹھے کچھ ہو گیا تھا۔ کیا ڈاکٹر کو بلالیں؟''

پتہ نہیں تینوں بیٹوں میں سے کون بول رہا تھا۔

مجھے ایسے لگا جیسے اباجی کے ساتھ میرے داداجی اور پرداداجی بھی میری عیادت کے لئے آئے ہوئے ہیں اور میرے پوتے اور پڑپوتے بھی میرے اردگرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ زمان کو پھر ایک نقطے میں سمٹتے دیکھ کر مرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ میں نے سامنے ٹنگی ہوئی اباجی کی تصویر کی طرف دیکھا تو اُن کے ہونٹوں پر بھی مجھے اپنے جیسی مسکراہٹ دکھائی دی۔ جلتی، بجھتی، چمکتی مسکراہٹ۔

پتہ نہیں اباجی کی تصویر کے ہونٹوں پر میری مسکراہٹ کا عکس تھا یا میرے ہونٹوں پر اباجی کی مسکراہٹ کا عکس تھا!



''روشنی کی بشارت''اور''قصے کہانیاں''

دوافسانوی مجموعوں کے بعد لکھے گئے

# افسانے



# کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار

(اپنے پوتے شہر یار حیدر کے نام جس نے اس کہانی کو مکمل کرایا)

داستاں گو کی ذات سے اُبھرے

جتنے کردار داستاں کے تھے

یہ ایسے کہانی کار کا قصہ ہے جس کے سامنے کہانیاں بار بار آتی ہیں کہ وہ انہیں اپنا تخلیقی لمس عطا کر کے ادبی دنیا کے سامنے پیش کرے لیکن کہانی کار ان کہانیوں سے بھاگا پھر رہا ہے۔اتنی ساری کہانیاں جو اس کا ایک نیا افسانوی مجموعہ تیار کر دیں۔یہ کہانی کار صحافیانہ طرز کے افسانے اور ناول لکھنے والا ہوتا تو اب تک ایسی ہر کہانی کی دو دو تین تین کہانیاں بنا کر دو تین مجموعے چھپوا چکا ہوتا۔دراصل کہانی کار کی جان ایک کہانی میں اٹکی ہوئی تھی اور وہ کہانی پوری طرح اس کی گرفت میں نہیں آرہی تھی۔بس فلمی عشق جیسی سچوئیشن ہو رہی تھی، جو کہانیاں کہانی کار کے پیچھے تھیں، وہ انہیں لفٹ نہیں کرا رہا تھا اور وہ جس کہانی کے تعاقب میں تھا وہ ٹھیک سے اس کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔

کہانی کار جس کہانی کے تعاقب میں تھا وہ دراصل ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کے موضوع سے متعلق تھی۔ایٹمی جنگ کے بعد چند انسان روئے زمین پر کسی طرح بچ گئے تھے اور بد قسمتی سے وہ سب الگ الگ مذاہب اور الگ الگ فرقوں کے لوگ تھے۔پانی کے عظیم طوفان، طوفانِ نوح میں اچھے اچھے جوڑوں کو کشتی میں محفوظ کر کے بچا لیا گیا تھا تا کہ دنیا کو اس کے گناہوں

کی سزا دینے کے بعد پھر سے زندگی سے لبریز کیا جا سکے۔لیکن یہ کہانی جو کہانی کار کے قابو میں نہیں آ رہی،اس میں پانی کے طوفان سے زیادہ بڑا اور ہولناک ایٹمی طوفان آ چکا ہے۔اتنی ترقی یافتہ اور ہنستی بستی دنیا پتھر کے زمانے میں چلی گئی ہے لیکن پتھر کے زمانے جیسی بے خبری سے بھی محروم ہو چکی ہے۔پہلے پہل زندہ بچنے والے ایک فرقے کے فرد نے جب دیکھا کہ وہ زندہ بچ گیا ہے تو اُس نے اسے اپنے مسلک کی سچائی قرار دے کر خود کو خدا کا پسندیدہ بندہ سمجھ لیا۔لیکن جب معلوم ہوا کہ ایسے کتنے ہی ''خدا کے پسندیدہ بندے'' بچ گئے ہیں اور وہ سب کے سب متحارب مذاہب اور فرقوں کے افراد ہیں تو پھر ان سب کے درمیان مذہبی مخاصمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔سب ہی خدا کے نیک بندے ہیں اور سب ہی ایک دوسرے کی تکفیر و تکذیب کر کے اپنی صداقت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔اتنے بڑے پیمانے پر ہو جانے والی انسانی تباہی اور ساری دنیاوی ترقیات کے خاتمہ کی بھی ان لوگوں کو پرواہ نہیں ہے اور اب بھی یہ سارے بچے کھچے مذہبی لوگ ایک دوسرے کے خلاف اپنا اپنا زہر اگل رہے ہیں۔ایک دوسرے کی تکفیر و تکذیب کر رہے ہیں۔

کہانی کار جو ہمیشہ سے اس دھرتی پر انسانوں کے رہنے کی تمنا کیا کرتا تھا،اس منظر پر حیرت زدہ ہے اور سارے فرقہ پرستوں کی پرانی متعصّبانہ روش سے تنگ آ کر دھرتی سے انسانوں کے مکمل خاتمہ کی دعا کرنا چاہتا ہے لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی کہ کہانی کو کیسے مکمل کرے۔کیا بددعا پر کہانی کو ختم کیا جائے یا پھر کوئی آسمانی آفت لا کر سارے بچے کھچے متعصب انسانوں کو ختم کیا جائے۔اگر آسمانی آفت لائی جائے تو کیسی ہو؟ کہانی کار ابھی تک اس مسئلے میں الجھا ہوا ہے اور کہانی اسی وجہ سے اس کے قابو میں نہیں آ رہی۔

جو ڈھیر ساری کہانیاں کہانی کار کے پیچھے پڑی رہتی ہیں ان میں سے کئی واقعی بڑی عمدہ کہانیاں ہیں۔کہانی کار اپنے مخصوص انداز کے ساتھ انہیں بہترین کہانیوں کا روپ دے سکتا ہے لیکن اس کا دل تو اسی کہانی میں اٹکا ہوا ہے۔

ایک اولڈ ہوم میں ملازمت کے باعث کہانی کار کو اولڈ ہوم کے ہر کردار میں ایک جاندار کہانی ملتی ہے۔Frau Wells جب اس ہوم میں آئی تھی تو پوری طرح باہوش و حواس



تھی۔چلنے پھرنے،اٹھنے بیٹھنے،کھانے پینے میں ایک وقار جھلکتا تھا۔چند دنوں کے بعد ہی اس کی ذہنی حالت متغیر ہو گئی۔ایسے لگتا جیسے کوئی کوما کی حالت میں چل رہا ہو۔Frau Bongers تو جب ہوم میں آئی تب ہی سے گمشدہ دکھائی دی۔Frau Olbrisch, Frau Voss, Frau اور Hoppe کی سوئیاں جیسے اپنی اپنی زندگی کی کسی ایک ہی جگہ پر اٹکی ہوئی تھیں۔فراؤ اول برش وقفے وقفے سے بی بی مریم اور یوسف (نجار) کے رشتے پر کچھ ایسی بات کرتی کہ کچھ سننے والے ہنس پڑتے اور کچھ خاموشی میں ہی عافیت سمجھتے۔کہانی کار بھی کبھی اس کے اسٹیریو ٹائپ جملے پر ہنس پڑتا اور کبھی بیزاری کی حد تک بیگانگی محسوس کرتا۔ایک بار یونہی اسے خیال آیا کہ اگر فراؤ اول برش اس کے پرانے وطن میں ہوتی اور وہاں ایسی یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات کہتی تو اس کی غیر حاضر دماغی کے باوجود اور پچانوے سالہ عمر کے باوجود وہاں کے دینی غیور حضرات اسے ہلاک کر کے ثواب کما چکے ہوتے۔فراؤ فوس کی سوئی بھی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔وہ تین الفاظ باری باری بولتی اور بولتی ہی رہتی۔Bitte mal kommen, hallo, aua.. (براہِ کرم ادھر آؤ،ہیلو،ہائے مجھے تکلیف ہو رہی ہے) یا پھر Hilfe کی صدا لگا کر مدد کے لئے پکارتی۔کئی بار ایسا ہوا کہ کہانی کار خود اس کی پہلی صدا پر اس کے پاس پہنچا۔اس کی خیریت دریافت کی۔سب خیر ہے نا؟ پوچھا۔فراؤ فوس اس کے باوجود اپنے جملے دہراتی رہی۔تب کہانی کار نے اس کے پہلے تین الفاظ کو ردھم کی صورت میں گنگنانا شروع کر دیا۔بٹّے مال کومن ،ہلّو۔اوّا۔۔۔ بٹّے مال کومن ،ہلّو۔اوّا۔۔۔فراؤ ہوپے کی سوئی بھی پہلے دن سے دو باتوں پر اٹک گئی۔میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور میں کہاں رہتی ہوں؟ جب بھی اسے کھانا دینے لگو وہ یہی کہتی کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔اور جب کھانا کھا لیتی تو پوچھنا شروع کر دیتی کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ایک دو بوڑھیاں تو کبھی کبھار کپڑوں سے بھی بے نیاز ہونے کی تگ و دو کرتیں۔وہ تو خدا بھلا کرے ان نرسوں کا جو ان کی نیپیز اتنی کس کر باندھتی تھیں کہ اسٹرپ ٹیز کا آخری مرحلہ آنے کی نوبت نہیں آ پاتی تھی۔ورنہ اپنی لہر میں آئی ہوئی نوے سالہ بی بیوں کو کوئی روک نہ سکتا۔یہ سب گمشدہ لوگ تھے۔اپنے آپ سے اور اپنے سارے پیاروں سے بچھڑے ہوئے لوگ۔ایسے پیاروں سے جو خود انہیں اس برزخ

میں لا کر چھوڑ گئے تھے اور منتظر تھے کہ کب ان کی وفات کی خبر آئے اور وہ دل گرفتہ سے ان کی آخری رسومات کا فرض ادا کر کے اس فرض سے سبک دوش ہو سکیں۔

اسی اولڈ ہوم میں ہی زندہ دلی کی کئی کہانیاں بھی موجود تھیں۔Herr Wirth نے اپنی عمر بھر کی کمائی اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کر دی تو وہ بہلا پھسلا کر باپ کو اولڈ ہوم میں داخل کرا گئی۔ ہر وِرتھ تنومند بزرگ تھے۔ دراز قد ہونے کے ساتھ جسم بھی تنا ہوا تھا لیکن بیٹی کے طرزِ عمل نے انہیں گہرا زخم لگایا تھا۔اولڈ ہوم میں جب jasica داخل ہوئی تو اس نے ہر وِرتھ کی میز کا انتخاب کر لیا۔ ہوم کے ریستوران میں ان کی دوستی کی گہرائی کو ہر کوئی محسوس کر رہا تھا۔اس دوستی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہر وِرتھ اپنی بیٹی کے دیئے ہوئے دکھ کو بھول سے گئے اور نقصان یہ ہوا کہ وہ جیسیکا کی دوستی میں اس حد تک چلے گئے جس حد کی ان کی عمر اجازت نہیں دیتی تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا سے ہی رخصت ہو گئے۔لیکن کہانی کار کا خیال ہے کہ اس نقصان میں بھی ان کا فائدہ ہی ہوا کہ دنیا کے ہر جھنجھٹ سے نجات پا گئے۔

Frau Muller، Frau Meixner, Frau Kruschel،Herr Rebsch اور کئی ایسے کردار جو وہیل چیئر پر ہوتے ہوئے بھی ہر وقت ہنستے اور ہنساتے رہتے ہیں۔فراؤ زالس گیبر بھی انہیں میں شامل ہے لیکن ایک دن پتہ نہیں اس بانوے سال کی خاتون کو کیا ہوا کہ بے ساختہ رونے لگ گئی۔جب اس سے رونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگی کچھ نہیں بس مجھے تھوڑا سا رو لینے دو،ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔

Frau Grossman رکھ رکھاؤ والی لیکن زندہ دل خاتون تھی۔ایک بار پتہ نہیں کیسے ایک عجیب سا واقعہ ہو گیا۔اولڈ ہوم کی پانچویں منزل پر مرمت کا کچھ کام ہو رہا تھا۔وقفہ کے دوران ایک مزدور نے ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا تو کمرہ خالی تھا۔وہ وہیں بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی۔اتفاق سے اس کمرے کی رہائشی فراؤ برگ من ریستوران سے اپنے کمرے میں آئی تو اپنے بیڈ پر ایک مرد کو دیکھ کر اس نے ہنگامہ کر دیا۔اس ساری صورتحال میں خرابی والی کوئی بات نہ تھی اس لئے معاملہ معمولی تفتیش کے بعد رفع دفع ہو گیا لیکن فراؤ گروس من کی زندہ دلی اگلے دن بھی جاری



تھی۔''بھئی ایسا ہوتا رہا تو لگتا ہے کبھی میری پوتی مجھے ملنے آئے تو آگے اسے دادی کے ساتھ اپنا نیا چچا بھی دیکھنے کو ملے۔۔۔سچ تب تو بڑی شرمندگی ہوگی''

Frau Wirth سے کہانی کار کو کچھ کوفت سی ہوتی تھی۔اس کی اتنی خدمت کرنے کے باوجود ایک بار اس نے خود سنا کہ وہ کسی کے ساتھ اپنے ملک میں آ کر بس جانے والے غیر ملکیوں کے خلاف بات کر رہی تھی۔اسے بہت دکھ ہوا۔لیکن یہ لوگ عمر کے ایسے مقام پر ہیں کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی بحث کرنا یا کسی ناراضی کا اظہار کرنا بجائے خود زیادتی ہے۔ایک دن پتہ نہیں کیوں کہانی کار کا دل چاہا کہ آج فراؤ وِرتھ کے آنے سے پہلے اس کے لئے اس کا پرہیزی مگر پسندیدہ ناشتہ وہ خود تیار کر رکھے۔اس نے اس کے لئے بریڈ کے ٹکڑوں کو اچھی طرح سے مارملیڈ لگایا اور جو کچھ وہ چاہا کرتی تھی ویسا کر کے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔جونرس اسے وہیل چیئر پر لے کر آیا کرتی تھی۔وہ آئی تو اس نے یہ خبر سنائی کہ فراؤ وِرتھ فوت ہو گئی ہے۔وہ دیر تک فراؤ ورتھ کے لئے تیار کردہ ناشتے کو دیکھتا رہا اور پتہ نہیں کیا کچھ سوچتا رہ گیا۔

یہ تو صرف اولڈ ہوم کی بے شمار کہانیوں میں سے چند کہانیوں کی جھلکیاں ہیں جو ایک عرصہ سے کہانی کار سے تقاضہ کر رہی تھیں کہ وہ انہیں لکھے۔انٹرنیٹ پر کہانی کار کو کئی کہانیوں نے الگ سے گھیرا ہوا تھا۔chat اور cheat کے فرق کو مٹاتی ہوئی کہانیاں بھی اور محبت و اخلاص کی کہانیاں بھی۔مختلف شناختی ناموں کے ساتھ اپنی عظمت کا پرچم خود ہی بلند کرنے والے ادیبوں کی کہانیاں بھی اور واقعتاً ادب کی خدمت کرنے والے تخلیق کاروں کی کہانیاں بھی انٹرنیٹ پر مل رہی تھیں۔خود کہانی کار نے ایک نیک دل خاتون سے رابطہ ہونے پر اسی کے تعاون کے ساتھ اپنا ایک ادبی منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا تھا۔اس نیک دل خاتون کے اخلاص کی کہانی میں جان تھی۔پھر ایک امریکن خاتون سے دوستی۔۔۔جب اس نے اسے اپنا ایک مسئلہ بتایا تو وہ اس کے حل کے لئے نہ صرف راضی ہو گئی بلکہ جرمنی بھی پہنچ گئی،لیکن پھر وہ مسئلہ کوئی اور صورت اختیار کر گیا اور وہ امریکن خاتون اداس سی واپس چلی گئی۔

کہانی کار کے جعلی ادیبوں سے تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں تھے کہ ایسا کرنا کہانی کار کے

مزاج کے خلاف تھا۔اس کے مخالفین نے اس کے ساتھ کئی کھیل کھیلنے کی کوشش کی لیکن ہر بار منہ کی کھائی۔مخالفین کی انٹرنیٹ پر سرگرمیوں کی اپنی الگ کہانی تھی۔ایک بار انہوں غزالہ کے فرضی نام سے ای میل کی۔جس نے لکھا کہ میں میر پور خاص میں ریڈیو اناؤنسر ہوں، کہانیاں لکھنے کا شوق ہے، آپ کی مداح ہوں اور آپ سے کہانیوں پر نظر ثانی کرانا چاہتی ہوں۔کہانی کار پہلی نظر میں ہی ''عرفانِ سائبر'' سے آشنا ہوگیا۔اس نے جواب لکھا کہ ذرا اپنا ٹیلی فون نمبر بھیجئے۔آپ سے چند باتیں پوچھنی ہیں۔''ریڈیو اناؤنسر غزالہ'' نے جواب لکھا کہ ہمارا گھریلو ماحول ذرا سخت سا ہے اس لئے ٹیلی فون نمبر نہیں دے سکتی۔اور کہانی کار اس معصومانہ جواب پر زیرلب مسکرا کر رہ گیا۔

دوسری بار ڈٹسن باخ یا اوفن باخ سے کسی کومل بی بی نے رابطہ کیا۔میں آپ کی تحریروں کی مداح ہوں۔مجھے شاعری کا شوق ہے۔میری خالہ بھی میرے ساتھ ہیں( کہانی کار کی عمر کا خیال کرتے ہوئے مداح کے ساتھ کہانی کار کی سہولت کے لئے ہم عمر خالہ بھی شامل کر دی گئی )۔کومل بی بی انٹرنیٹ سے ٹیلی فون پر آ گئی۔گویا غزالہ والے ڈرامے میں جو کسر رہ گئی تھی اسے اب پورا کیا جا رہا تھا۔کہانی کار پر انٹرنیٹ سے ہونے والا یہ وار بھی خالی گیا۔کچھ عرصہ کی خاموشی کے بعد یار لوگوں نے خاصی محنت کے ساتھ انتظامات کئے۔اس بار فیصل آباد سے کسی بشریٰ سراج نے ڈائرکٹ ٹیلی فون کر دیا۔''سر! میں نے آپ کو پڑھا ہے، میں آپ کی بہت بڑی مداح ہوں۔۔۔میں نے آپ کو ابھی ای میل کی ہے لیکن پھر مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں نے آپ کو ٹیلی فون کر دیا۔اگر آپ اجازت دیں تو میں کبھی کبھار آپ کو فون کر لیا کروں؟''

کہانی کار نے اسے سمجھایا کہ مجھے آپ کے ٹیلی فون کے آنے سے خوشی ہوگی لیکن اس میں آپ کا کافی خرچہ ہو جایا کرے گا۔اس لئے بہتر ہے آپ انٹرنیٹ سے رابطہ رکھیں۔تب بشریٰ سراج نے پہلا جوش و جذبہ برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ ہم بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں اس لئے خرچے کی آپ فکر نہ کریں۔پہلی ای میل میں غیر شادی شدہ بشریٰ سراج نے خود کو قریشی ظاہر کیا جسے کہانی کار نے نظر انداز کر دیا۔البتہ اسے لکھا کہ آپ اپنا پوسٹل ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر بھیج دیں۔خوشحال اور کھاتے پیتے گھرانے والی بی بی نے دونوں چیزیں بھیج دیں لیکن ٹیلی فون کا نمبر پی



پی تھا اور پوسٹل ایڈریس میں والد کا نام رانا سراج درج تھا۔باپ رانا اور بیٹی قریشی۔پھر اسی پر بس نہیں ہوا، بشریٰ سراج یاہو کے چیٹ بکس میں جن اوقات میں آتی وہ جرمنی کے اوقات سے تو میل کھاتے تھے لیکن پاکستان کے اوقات سے ان کا کوئی میل نہیں تھا۔جرمنی میں رات کے دس بجے کوئی بھی آن لائن ہوسکتا ہے لیکن تب پاکستان میں رات کے دو بجے ہوتے ہیں اور بشریٰ سراج رات کے دو بجے آن لائن ہوتی تھی۔کہانی کار عرفانِ ذات کی بجائے عرفانِ سائبر سے مزید آشنا ہوا اور ان مخالفین پر پہلے ہنس دیا اور پھر رو دیا جو اس کے لئے اتنے پاپڑ بیل رہے تھے۔یہ واقعات بھی کہانی کار سے کچھ لکھنے کا تقاضہ کر رہے تھے۔

جرمنی میں بہت سارے ہم وطنوں کی بہت ساری انوکھی کہانیاں بھی اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔بالے نے جب پہلی بار جرمنی میں مزدوری کا کام شروع کیا اور اسے ایک کار والے نے تھوڑی سی رقم بطور ٹپ دے دی، اس دن وہ بہت دل گرفتہ تھا۔دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں کہ ہم جو اپنے وطن میں دوسروں کو ٹپ دیا کرتے تھے اب ہمیں یہاں ٹپ دی جا رہی ہے۔آخر اس نے ٹپ دینے والے کو ایک موٹی سی گالی دی اور پھر اسے کچھ قرار سا آ گیا۔ اور اب چند برسوں کے عرصہ میں ہی اسی بالے کا یہ حال ہے کہ جس دن اسے ٹپ نہیں ملتی یا کم ٹپ ملتی ہے، اس دن وہ ان سارے لوگوں کو گالیاں دے رہا ہوتا ہے جو کنجوس ہو گئے ہیں۔اس کہانی کی بہت ساری جزئیات ہیں جو پاکستان سے جرمنی تک پھیلی ہوئی ہیں۔کہانی کئی بار کہانی کار کا پیچھا کر چکی ہے لیکن کہانی کار کو اپنی اس محبوب کہانی کے علاوہ کسی کی فکر نہیں جو اس کے قابو میں نہیں آ رہی۔

جرمنی کے ظفری میاں کی کہانی تو بہت سارے چٹ پٹے مسالوں کے ساتھ درسِ عبرت بھی لئے پھرتی ہے لیکن کہانی کار اس کے لئے بھی وقت نہیں نکال رہا۔ظفری میاں جب جرمنی آئے تھے تو انہوں نے یہاں سیٹ ہونے کے لئے ایک جرمن لڑکی سے شادی کر لی۔
لڑکی ان کے ساتھ مخلص تھی لیکن ظفری میاں اپنی موج میں تھے۔جب خود کو سارے قانونی تحفظات مل گئے تو انہوں نے بیوی سے بات کی کہ میں چاہتا ہوں میرا چھوٹا بھائی بھی یہاں

آجائے اور سیٹ ہو جائے۔ بیوی تو تم میری ہی ہو۔ اسلامی نکاح ہمارا بحال رہے گا لیکن سرکاری شادی کو ہم ختم کراتے ہیں اور پھر تم میرے چھوٹے بھائی سے قانونی شادی کر لینا، اس طرح وہ آسانی سے جرمنی میں آجائے گا۔ چنانچہ منصوبے کے مطابق سب کچھ انجام پا گیا اور ظفری کا چھوٹا بھائی نہ صرف جرمنی میں آگیا بلکہ جرمنی میں سیٹ بھی ہو گیا۔ اس کے بعد ظفری نے اپنے ایک ماموں زاد کو اور پھر ایک پرانے دوست کو بھی باری باری اسی طرح جرمنی بلوایا اور یہاں سیٹ کرا دیا۔ یہاں تک تو کہانی ٹھیک رہتی ہے لیکن مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب ظفری کی جرمن بیوی خود کہانی کار کے پاس گئی اور اسے رو رو کر بتانے لگی کہ تمہارے دوست نے مجھ سے اس حد تک کام لئے اور میں اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی جسمانی اور ذہنی طور پر صرف اسی کے ساتھ رہی ہوں لیکن اب وہ مجھے اپنانے سے انکار کر رہا ہے۔ کہانی کار اس صورتحال پر کافی دکھی ہوا۔ اس سے ہمدردی کرتا رہا لیکن اس کی کہانی کو ابھی تک لکھ نہیں سکا۔

پھر ان مولوی صاحب کی کہانی جنہوں نے یورپ میں سیٹ ہونے کے لئے اپنے ایک مقتدی سے کہا کہ کسی میم سے صرف پیپر میرج کرا دو۔ میں ان مشرک اور فاحشہ عورتوں کے ساتھ کوئی جسمانی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ بس قانونی تحفظ کے لئے پیپر میرج کروں گا۔ جب کاغذی کاروائی کا بنیادی مرحلہ مکمل ہو گیا تو مولوی صاحب میم کی منت کرنے لگے کہ چلو جب تک یہ کاغذی کاروائی قائم ہے تب تک ہم مل بھی لیا کریں لیکن میم نے طے شدہ باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ اُس کی کافرانہ اداؤں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مولوی صاحب کے نورانی چہرے سے ذرہ بھر بھی متاثر نہیں ہوئی تھی، نہ ہی ان کی منت سماجت سے اس کا دل پسیجا تھا۔ حالانکہ مولوی صاحب کی اچھی خاصی رقم اس پروجیکٹ پر لگ چکی تھی اور ابھی مزید کافی خرچہ ہونا تھا۔ تب مولوی صاحب اپنے مقتدی کی منت کرنے لگے کہ اسے راضی کر دو۔ یہ کہانی خاصی عبرتناک تھی لیکن کہانی کار نے اس کو بھی نظر انداز کر دیا۔

پھر ان دو فنکار بھائیوں کی کہانی جو یہاں کے قوانین سے ٹیکنیکل فائدے اٹھانے کی ترکیبیں سوچتے اور ان پر عمل کرتے رہتے۔



ایک نسبتاً اچھی کار لیتا۔ اس کی اچھی انشورنس کراتا۔ پھر دوسرا بھائی اس گاڑی کو اپنی گاڑی سے ٹکر مارتا۔ پہلے بھائی کو انشورنس کی بڑی رقم مل جاتی جسے دونوں مل کر بانٹ لیتے۔ جب تین چار بار انہیں دو بھائیوں کے ہی ایک جیسے ایکسیڈنٹ ہونے لگے تب انشورنس کمپنی کا ماتھا ٹھنکا اور تب دونوں کا فراڈ پکڑا گیا۔

جرمن انتظامیہ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والی کہانیاں۔۔۔۔ جب پاکستانی نئے نئے یہاں آتے تھے سب کو ہر طرح کی عزت دی جاتی۔ ان کی ہر بات کو سچ سمجھا جاتا۔ ڈرائیونگ لائسنس کے حصول کے لئے لوگوں نے اپنے پاکستانی راشن کارڈ یہ کہہ کر جمع کرائے کہ یہ ہمارے پاکستانی ڈرائیونگ لائسنس ہیں۔ انتظامیہ نے یقین کیا اور ایسے لوگوں کو لائسنس جاری کر دیئے۔ پھر کئی ایسے حادثات ہونے لگے کہ ون وے روڈ پر مخالف سمت سے گاڑی ڈال دی گئی۔ تب راشن کارڈوں کی جانچ پڑتال شروع ہوئی اور اب سب کو ڈرائیونگ لائسنس کے حصول کے لئے ایک جان لیوا ٹیسٹ سے گزرنا ہوتا ہے۔ اور اب ان کے ہر سچ کو بھی شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی کئی کہانیاں جو قوم کو احساس دلا سکتی ہیں کہ تم لوگ جو پہلے یہاں آتے تھے اور تمہاری اتنی عزت کی جاتی تھی تو اب جو تمہارے تئیں رویے بدلے ہیں تو اس میں خود تمہاری اپنی ہیرا پھیریوں اور فراڈ بازیوں کا قصور ہے۔ لیکن کہانی کار ان کہانیوں کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ رہا۔

کہانی کار کے بڑے پوتے کی عمر ساڑھے پانچ سال ہے۔ اگرچہ سارے بچے ایک ہی شہر میں رہتے تھے اور ہفتہ میں ایک دو بار سب سے ملنا ملانا ہو جاتا تھا۔ تاہم سوتے سب اپنے اپنے گھر میں ہی تھے۔ اس دن پتہ نہیں دادا، پوتا دونوں ہی کس لہر میں تھے کہ دادا نے پوتے کو اپنے پاس رہنے کے لئے کہا اور پوتا فوراً راضی ہو گیا۔ رات کو دادا نے پوتے کو اپنے ساتھ لٹا لیا اور اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے اپنے پوتے سے کچھ مخصوص دعاؤں کے بارے میں پوچھا۔ بچے کو چند دعائیں یاد تھیں جو اس نے سنا دیں۔ پھر کہانی کار نے اپنے پوتے سے پوچھا ''کیا تمہیں کوئی حدیث شریف بھی یاد ہے؟''۔۔۔ پوتے نے فوراً کہا ''جی دادا ابو! مجھے

ایک حدیث شریف یاد ہے۔''اسے حیرت ہوئی کہ بچے کو حدیث کا بھی پتہ ہے اور کچھ یاد بھی ہے۔اس نے کہا اچھا شاباش حدیث شریف سناؤ!۔۔۔۔۔۔بچے نے بڑی روانی کے ساتھ بولنا شروع کیا:

''حدیث شریف ہیلپنگ ہینڈ کے تعاون سے پیش کی جا رہی ہے۔ماماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے''

کہانی کار کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ نکلا۔ایک ٹی وی چینل پر اذان سے پہلے ایک خیراتی ادارہ ہیلپنگ ہینڈ کی جانب سے اشتہار دیتے ہوئے کوئی حدیث پیش کی جاتی تھی۔یہ حدیث اس کے پوتے نے وہاں سے سنی تھی اور اپنی سادگی میں سپانسر کرنے والوں کا ذکر بھی روانی میں کر دیا تھا۔اور جہاں کچھ دقت محسوس ہوئی وہاں ترجمہ بھی بدل لیا تھا۔پوتا اپنے دادا کی ہنسی کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔کچھ دیر ہنسنے کے بعد کہانی کار کو خیال آیا کہ اپنے پوتے کو اپنے بچپن کی سنی ہوئی کہانیاں سنائی جائیں۔چنانچہ دادا نے سب سے پہلے اپنی بوا سے سنی ہوئی ایک کہانی سنانی شروع کی۔لیکن کہانی کو بیان کرتے وقت اسے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ پوتے کو بات سمجھانے کے لئے اسے اصل کہانی میں کافی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

''ایک بوڑھی عورت بھٹی والی سے مکئی کے دانے بھنوا کر جا رہی تھی کہ رستے میں اسے ٹھوکر لگی اور اس کے دانے زمین پر بکھر گئے۔''یہ کہنا مشکل لگ رہا تھا۔بچے کو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔

''ایک بوڑھی عورت ایک مارکیٹ سے پاپ کارن خرید کر نکلی۔۔۔۔''کہانی کار نے پوتے کو سمجھانے کے لئے کچھ ایڈجسٹ منٹ کرنا شروع کی لیکن صاف لگ رہا تھا کہ وہ کہانی سنانے کی بجائے کہانی کا ترجمہ کرنے لگ گیا ہے۔وہ بوڑھی اماں کے مخالف کوّے کی بات سناتا تو پوتا اسے جرمنی میں دکھائے جانے والے مقبول کارٹونز کے کردار پیٹرک کی بات سنانے لگ جاتا۔وہ پوتے کو باتیں کرنے والی ڈانگ،نہر،وغیرہ کا بتاتا تو پوتا اسے sandy, Tadios, spongebob وغیرہ کی بات سنانے لگ جاتا۔وہ کہانی میں آنے والے بلی اور چوہے کا ذکر کرنے لگا تو پوتا چھلانگ مار کر ٹام اینڈ جیری کے کئی ایپی سوڈز اسے سنانے لگ گیا۔یوں اس کی بوا والی کہانی تو ادھوری رہ گئی



لیکن پوتے کی کہانیاں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔اسے خوشی بھی ہو رہی تھی اور افسوس بھی۔بوا والی کہانی کے ادھورے رہ جانے سے زیادہ اسے اس بات کا دکھ تھا کہ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اگلی نسل کے ساتھ اتنے گہرے ربط کے باوجود ایک گہرا فاصلہ پیدا ہو رہا ہے لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ پوتا اسے خود سے اور اپنے عہد سے ہم آہنگ کر رہا تھا۔بوا کی سنائی ہوئی کہانیوں کا اپنا مزہ تھا لیکن اب کارٹون کہانیوں میں بچوں کے لئے دلچسپی کا سامان کہیں زیادہ ہے۔شاید اتنا زیادہ کہ پرانے بڑے بھی ٹی وی کے آگے بیٹھ جائیں تو بچوں کی طرح مزہ لینے لگیں۔

پھر وہ رات، جب تک دونوں جاگتے رہے، دادا نے پوتے سے کہانیاں سننے میں گزار دی۔اور اسی رات کہانی کار نے سوچا کہ اپنی ادھوری کہانی میں کسی امتیاز کے بغیر ہر مذہب و مسلک کے سارے کے سارے انتہا پسندوں کو ایٹمی جنگ سے ہلاک کر کے صرف اپنے پوتے جیسے انسانوں کو بچایا جائے اور انہیں کے ذریعے نسلِ انسانی کو پھر سے دھرتی پر آباد کیا جائے۔

لیکن ابھی یہ صرف کہانی کار نے سوچا ہے،

کہانی لکھتے وقت کیا روپ اختیار کر جائے!

اس کا تو خود کہانی کار کو بھی علم نہیں ہے۔

☆☆☆

# نیک بندوں کی بستی

الجھے جو فقیروں سے
یوں سمجھو، الجھے
اپنی تقدیروں سے

یہ نیک بندوں کی انوکھی بستی تھی جہاں سارے نیک لوگ ہی بستے تھے۔گناہ کے تصور سے ہی خوف کھانے والے اور گناہگاروں کے لیے غضب ناک نیک بندے۔کسی کی معمولی سی لغزش کو معاف نہیں کیا جاتا تھا۔ان کا خیال تھا کہ معمولی غلطیوں کو نظر انداز کیا گیا تو بڑے گناہ جنم لینا شروع کر دیں گے اور دھرتی ناپاک ہو جائے گی۔یہ نیک بندے اپنے عقائد میں کسی قسم کے اجتہاد کو اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں معمولی کوتاہی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔

ایک بار ایک مجذوب فقیر اس گاؤں میں آ گیا۔بستی کے لڑکوں، بالوں نے اس مجذوب سے باتیں کیں تو انہیں لگا کہ ان کے خدا کے محدود تصور کے برعکس اس مجذوب کی باتوں میں ایک ایسے خدا کا احساس ملتا ہے جو سچ مچ لامحدود ہے اور جس کی محبت بھی دل دہلا دینے والی ہے۔

مجذوب نوجوانوں کو بتا رہا تھا کہ خدا خود کہتا ہے کہ جو مجھے ڈھونڈتا ہے، وہ مجھے پا لیتا ہے۔اور جو مجھے پا لیتا ہے وہ مجھے دیکھ لیتا ہے۔جو مجھے دیکھ لیتا ہے وہ میرا عاشق بن جاتا ہے۔جو میرا عاشق ہو جاتا ہے، اُسے میں قتل کر دیتا ہوں اور جسے میں قتل کر دیتا ہوں، اُس کا خون بہا میں خود ہو جاتا ہوں۔



تب نیک بندوں کی اس بستی کی بڑی عبادت گاہ کا منتظم وہاں سے گزر رہا تھا۔اس نے مجذوب کی یہ بات سنی تو پہلے اسے بھی یہ بات بہت اچھی لگی لیکن پھر یکدم اسے خیال آیا کہ یہ تو اس کے پختہ عقائد اور ایمان سے ہٹ کر بات کی گئی ہے۔صراطِ مستقیم سے ہٹی ہوئی بات کتنی ہی خوبصورت اور دل کو بھانے والی کیوں نہ ہو وہ سراسر گمراہی اور ضلالت ہے۔چنانچہ اس نے اسی وقت بستی کے بہت سارے نیک بندوں کو جمع کر کے صلاح مشورہ کیا اور اپنی نئی نسل کو کسی بھی طرح کی گمراہی اور ضلالت سے بچانے کے لیے فیصلہ کیا کہ یا تو یہ مجذوب نیک بندوں کی بستی کو چھوڑ دے یا پھر اسے قتل کر دیا جائے۔فیصلہ بظاہر یہی تھا لیکن حقیقت میں یہ طے ہوا تھا کہ مجذوب کو قتل کر دیا جائے گا۔اپنے فیصلے پر عملدرآمد کے لیے نیک بندوں کے سرپنچ مجذوب کے ٹھکانے پر پہنچے تو مجذوب غائب تھا۔جیسے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

نیک بندے پھر سر جوڑ کر بیٹھے کہ اپنی نئی نسل کو کسی بھی طرح کی گمراہی سے بچانے کے لیے کیا کیا جائے۔ایک نیک بندے نے مشورہ دیا کہ پار پرے کے ایک گاؤں میں خدا کے محبوب ایک بزرگ رہتے ہیں۔ان کو اپنے ہاں بلایا جائے اور ان کے ذریعے دین کی وہ باتیں سنی جائیں جن کے نتیجہ میں مزید نیکیوں کی تحریک ہو۔چنانچہ نیک بندوں کی بستی والوں نے دعوت دے کر خدا کے محبوب اس بزرگ کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ان سے ایک عام خطاب کا پروگرام طے ہوا تھا۔اتفاق سے یہ پروگرام ایسے ایام میں ہوا جب روزوں کا مہینہ چل رہا تھا۔پار پرے کے گاؤں سے آئے ہوئے خدا کے محبوب بزرگ کچھ علیل تھے، دوسرا سفر کی حالت میں تھے اس لیے انہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا کہ خدا کی طرف سے ان دونوں حالتوں میں سے کسی ایک حالت کی صورت میں بھی روزہ نہ رکھنے کی رعائت دی گئی تھی، جبکہ انہیں دہرے طور پر یہ رعائت حاصل تھی۔

جب پار پرے کے گاؤں کے بزرگ خطاب کر رہے تھے، انہوں نے دورانِ خطاب نیم گرم پانی کا ایک گھونٹ سب کے سامنے پی لیا۔حقیقتاً وہ ان سارے نیک بندوں کو بتانا چاہتے تھے کہ خدا کی طرف سے جو استثنائی رعائتیں دی جاتی ہیں، وہ بشری کمزوریوں اور سہولتوں کو مدِ نظر رکھ کر دی جاتی ہیں۔اس طرح وہ نیکی کے نام پر کٹّر پن کے رویے کو رد کرنا چاہتے تھے اور اپنے عمل

کے ذریعے اسے ظاہر کرنا چاہتے تھے۔لیکن خدا کے محبوب بزرگ کی نیک نیتی اور خدا کی دی ہوئی رعائت والی بات نیک بندوں کی سمجھ میں نہ آسکی۔انہوں نے فوراً بزرگ پر اعتراض جڑ دیا کہ آپ نے روزوں کے ایام میں روزہ نہیں رکھا۔تب بزرگ نے وضاحت کر دی کہ اپنی علالت اور مسافرت کے باعث انہیں روزہ نہ رکھنے کی رعائت خدا نے دی ہوئی ہے۔بزرگ کی دلیل نہایت معقول تھی لیکن نیک بندوں کے لیے یہ ان کی نئی نسل کے لیے مجذوب کی باتوں سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔انہوں نے روزوں کے ایام کے احترام کے نام پر ایمان افروز شور مچا دیا۔بزرگ اپنی طرف سے جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے وہ سب اس شور میں دب گیا۔نیک بندے یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ ایک بیمار اور مسافر جو خود ان کے مدعو کرنے پر اس بستی میں آیا تھا وہ روزوں کے ایام کی استثنائی رعائت کا حق دار ہے۔اس سارے ہنگامہ کا اثر نئی نسل پر ہو رہا تھا۔نئی نسل محسوس کر رہی تھی کہ ہمیں دیئے گئے احکامات کی روح کو مارا جا رہا ہے اور صرف ظاہری الفاظ پر تکیہ کر کے اپنی مخصوص نیکی کے عقائد مسلط کیے جا رہے ہیں۔بہر حال وہ بزرگ اپنا خطاب ادھورا چھوڑ کر چلے گئے اور نیک بندوں کی نئی نسل جو ابھی تک ایک جستجو کی کیفیت میں تھی اب باقاعدہ شبہات کا شکار ہونے لگی۔نیک بندوں کی بستی کے بڑے اپنی نئی نسل کی نئی سوچ سے مزید فکر مند ہوئے اور انہیں گمراہی اور ضلالت سے بچانے کے لیے کوئی اور ترکیب سوچنے لگے۔لیکن ان کے سوچتے سوچتے پورا ایک سال بیت گیا۔

نئے سال کے روزے شروع ہونے سے ایک دن پہلے نیک بندوں کی بستی میں وبائی ہیضہ پھیل گیا۔اور روزوں کے مہینہ کے پہلے دن ہی سے وہ سارے نیک بندے روزہ رکھے بغیر وبائی ہیضہ سے بچنے کے لیے مختلف دیسی دوائیاں پھانک رہے تھے اور ایک پھکی کے ساتھ نیم گرم پانی پی رہے تھے۔روزوں کے سارے ایام وبائی ہیضہ کی نذر ہو گئے۔ساری بستی دیسی دوائیں کھانے اور نیم گرم پانی پینے پر مجبور ہو گئی تھی۔اب کسی کو روزوں کے ایام کے احترام کا خود ساختہ فلسفہ نہیں سوجھ رہا تھا۔تب ایک نوجوان نے اپنی بستی کے سارے بزرگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:



’’آپ بزرگوں نے مجذوب فقیر کی طریقت کی باتوں کی روح کو سمجھے بغیر اُسے معتوب قرار دے دیا اور خدا کے محبوب بزرگ کی شریعت کی باتوں کو بھی ان کی روح کے ساتھ سمجھنے کی بجائے اپنی من گھڑت تاویلوں کے ذریعے رد کیا اور گھر پر بلائے ہوئے مہمان کی اہانت کی۔کیا اس بار روزوں کے مہینے میں آپ خود خدائی سزا کا شکار نہیں ہوئے؟ کہ نہ کسی کو روزہ رکھنے کی توفیق ملی اور نہ کسی کو اب روزوں کے احترام کا وہ من گھڑت فلسفہ یاد رہا جو پچھلے سال خدا کے ایک محبوب بزرگ کی اہانت کرنے کے لئے آپ کو شدت سے یاد آ گیا تھا۔‘‘

نوجوان کی باتوں کی باقی سارے نوجوان بھی تائید کر رہے تھے۔اور نیک بندوں کی بستی کے سارے بزرگ یہی سوچ رہے تھے کہ ان کی نئی نسل ان کے ہاتھوں سے نکل کر گمراہ ہو گئی ہے۔وہ اپنی نئی نسل کی گمراہی پر افسردہ تھے لیکن ان میں سے کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ وہ خود خدا کی طرف سے کیسی کھلی کھلی سزا پا چکے ہیں۔اور سزا پانے کے بعد بھی مسلسل ایک سزا کی حالت میں گھرے ہوئے ہیں۔



# اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

خواہش تھی کہ اک بار کبھی خود سے بھی ملتے
فرصت کبھی اے گردشِ حالات عطا کر

جرمنی کی مصروف ترین زندگی میں معمولاتِ زندگی مشینی انداز سے گزر رہے ہیں۔ مجھے نہ صرف بہت سارے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات نہ ہوسکنے کی حسرت رہتی ہے بلکہ کبھی کبھار تو خود سے ملنے کی بھی شدید خواہش ہوتی ہے۔لیکن یہاں مکروہاتِ دنیا سے یا معمولاتِ زندگی سے مہلت ہی نہیں مل رہی۔ مجھے اتنا اندازہ ہے کہ میرے اندر میرے باہر سے زیادہ بہتر، کچھ ہے۔لیکن جہاں بدن کے تقاضوں سے ہی جان نہ چھوٹ رہی ہو وہاں اندر کی طرف دھیان کہاں جاسکتا ہے۔

ڈیوٹی پر آنے جانے سمیت دس گھنٹوں کی مشقت کے بعد ساڑھے نو بجے شب کو گھر پہنچتے ہی پہلے لباس تبدیل کرتا ہوں، باتھ روم سے فارغ ہوتا ہوں۔ پھر انٹرنیٹ پر آئی ہوئی ای میلز دیکھتا ہوں اوران کے جواب لکھتا ہوں۔دس بجے شب ٹیلی کاسٹ ہونے والے جیو ٹی وی کے خبرنامہ کے پہلے پندرہ بیس منٹ کی خبریں دیکھنا میرا معمول ہے اوراسی دوران ہی رات کا کھانا کھاتا ہوں۔کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لئے باہر سیر کرنے کے لئے نکل جاتا ہوں۔دس منٹ کی سیر کے بعد واپس آ کر مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کر کے پڑھتا ہوں۔گیارہ بجے کسی اہم



ٹاک شو کو دیکھتا ہوں اور دیکھتے دیکھتے ہی صوفے پر سو جاتا ہوں۔صبح فجر کی نماز کے وقت پر جاگ جاتا ہوں۔حوائجاتِ ضروریہ کے بعد نماز، قرآن کی بچپن کی پڑی ہوئی عادت پوری کرتا ہوں۔ اس دوران بیوی بچے بھی جاگ جاتے ہیں۔سب اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاریوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ بیوی ناشتہ تیار کرتی ہے تو ہم دونوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر میں کچھ دیر کے لئے سو جاتا ہوں۔

دس بجے کے لگ بھگ جاگ کر تازہ دَم ہوتا ہوں۔ کچھ وقت انٹرنیٹ پر گزارتا ہوں۔ پھر ملازمت پر جانے کی تیاری کرتا ہوں۔سوا بارہ بجے والی بس مجھے میرے گھر کے پاس سے مل جاتی ہے۔بس پر بیٹھ کر اپنے شہر ہیٹرس ہائم کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچتا ہوں ۔وہاں سے مجھے فرینکفرٹ شہر تک جانا ہوتا ہے۔ پلیٹ فارم نمبر۳ پر فرینکفرٹ جانے والی ٹرین آتی ہے جبکہ پلیٹ فارم نمبر۲ پر فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آتی ہے۔ میں سیڑھیوں کے قریب اپنی ٹرین کا انتظار کرتا ہوں۔ میری ٹرین سے تین منٹ پہلے فرینکفرٹ سے ٹرین آجاتی ہے اوراس کے آگے جانے تک میری اپنی ٹرین پہنچ جاتی ہے۔ میں اپنی ٹرین کے آگے والے ڈبے میں بیٹھا کرتا ہوں کہ وہاں سے مجھے اپنی اگلی منزل کی طرف جانے میں چند قدموں کے چلنے کی بچت ہو جاتی ہے۔اس حساب سے چونکہ میں فرینکفرٹ جانے والی ٹرین کے پہلے ڈبے کے مقام پر کھڑا ہوتا ہوں،اس لئے فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کا آخری ڈبہ میرے قریب آ کر رُکتا ہے۔یوں میں تین منٹ کے عرصہ میں اس ٹرین سے اترنے والی سواریوں کو سرسری سا دیکھ لیا کرتا ہوں۔ہم سب آنے اور جانے والے مزدور اور دفتر پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔اس لئے تقریباً سارے چہرے عام طور پر جانے پہچانے سے ہوتے ہیں۔ایک دن میں نے معمول کے مطابق فرینکفرٹ کی طرف سے آنے والی سواریوں کو دیکھنے کی بجائے ویسے ہی اپنے پلیٹ فارم پر اپنی ٹرین کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھوں کو تھپتھپایا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو میرا چھوٹا بیٹا تھا جو طبیعت تھوڑی سی خراب ہونے کی وجہ سے دفتر سے جلدی آ گیا تھا۔اس کو ڈاکٹر سے فوری رجوع کرنے کی ہدایت کرنے کے باوجود مجھے اپنے بیٹے سے اس طرح کی اچانک ملاقات خوشگوار سی

لگی۔اور پھر عجیب سا معاملہ ہوا۔تب سے جب بھی میں فرینکفرٹ کی طرف جانے والی ٹرین کے لئے جاتا ہوں،فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو صرف اس وجہ سے دیکھتا ہوں کہ شاید میرا چھوٹا بیٹا پھر اس ٹرین سے اترے۔ایک بار سنیچر کا دن تھا۔آفس میں چھٹی کے باعث بیٹا گھر پر ہی تھا لیکن مجھے اپنے اولڈ ہوم میں معمول کے مطابق کام پر جانا تھا۔میں گھر کے دوسرے افراد کی طرح بیٹے سے بھی ہاتھ ملا کر اور خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلا۔لیکن شہر ہیٹرس ہائم کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر جیسے ہی فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آئی، میں اس طرح اسے دیکھنے لگا جیسے ابھی اس میں سے میرا بیٹا اُترے گا۔پھر مجھے خیال آیا کہ بیٹا تو گھر پر ہے، میں کس کا انتظار کررہا ہوں!اب بیٹے نے اپنی کار لے لی ہے اور وہ کار پر ہی آفس آتا جاتا ہے لیکن میں پھر بھی ہر بار فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو ایسے دیکھتا ہوں جیسے میرا چھوٹا بیٹا اس میں سے اترے گا اور میں اس سے ہونے والی ہلکی سی ملاقات کی خوشگواری کو محسوس کروں گا۔جاب پر جا کر سب سے پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیتا ہوں۔

پچھلے دنوں جرمنی کی سب سے زیادہ مالیت ۳۵ ملین یورو کی لاٹری کے بخار نے پورے جرمنی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔لاٹریوں کے چکر میں نہ پڑنے کے باوجود ۳۵ ملین اتنی بڑی رقم تھی کہ میں نے بھی اسے کھیلنے کا ارادہ کر لیا۔کچھ خاص دعائیں پڑھ کر حصہ لے لیا۔۳۵ ملین یورو کا مطلب ہے ساڑھے تین کروڑ یورو۔اور اس رقم کو پاکستانی مالیت میں تبدیل کیا جائے تو پونے تین ارب روپے بنتے ہیں۔

لاٹری کھیلنے کے بعد میں نے اس کا فیصلہ ہونے سے پہلے بہت سارے منصوبے بنا لئے تھے۔جرمنی میں ہی ایک بڑا رہائشی منصوبہ،جس میں میرے سارے بچے اپنے اپنے گھروں میں ایک ساتھ ہوں گے۔جرمنی میں ایک کمپنی کا قیام اور پاکستان اور انڈیا میں اس کمپنی کی طرف سے انویسٹمنٹ کے پروجیکٹس۔بچوں کے لئے ان کے ذہنی میلانات کے مطابق جرمنی میں مناسب کاروبار۔پاکستان میں اپنے پرانے گاؤں کے آس پاس ایک بڑی حویلی کی تعمیر۔پھر بہت سارے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے لئے بعض منصوبے،جن کے مطابق انہیں مالی امداد دینے



کی بجائے اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا کرنے کے منصوبے شامل تھے۔اسی طرح بعض فلاحی پروگرام شروع کرنے کے خاکے۔بہت ساری باتیں میرے ذہن میں آگئی تھیں اور میں نے خود کو ذہنی طور پر ان ساری ذمہ داریوں کے لئے تیار کر لیا تھا۔جس دن شام کو قرعہ اندازی ہونا تھی اس دن میری معمول کی تلاوت کے دوران سورۃ انفال کی آیت **انما اموالکم واولاد کم فتنۃ** نے مجھے ہلکا سا جھٹکا لگایا۔یہ آیت آج کے دن ہی کیوں پڑھنے میں آئی اور پڑھتے وقت اتنی توجہ کیوں کھینچ گئی؟۔لیکن پھر میں نے اسے ایک اتفاق سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

قرعہ اندازی کا شفاف عمل ٹی وی پر میں نے اور میرے بیٹے نے براہِ راست ایک ساتھ دیکھا۔میرا بیٹا کافی جذباتی ہو رہا تھا۔تب میں نے اسے سمجھایا کہ اگر انعام نکل آئے تو تب بھی اپنی حیثیت سے باہر نہیں ہونا۔انعام نہیں نکلتا تو غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔دونوں صورتوں میں خود کو نارمل رکھنا ہے۔قرعہ اندازی ہوئی تو ہمارا انعام نہیں نکلا۔۳۵ ملین کا انعام کسی اور کو مل گیا۔بیٹا میرے سمجھانے کے باوجود کافی افسردہ ہوا۔میں اسے تسلی دیتا رہا۔مجھے لاٹری کا بڑا انعام حاصل نہ کر پانے کا افسوس نہیں تھا لیکن اپنے کئی منصوبوں کے ادھورے رہ جانے کی تھوڑی سی حسرت دل میں ضرور ہونے لگی تھی۔انعام نکل آنے کی صورت میں اگلے دن میں نے اپنی مزدوری والی جاب پر نہ جانے کا طے کر لیا تھا۔انعام نہیں نکلا تو اگلے دن میں معمول کے مطابق اپنی جاب پر چلا گیا۔جاب سے واپسی پر روز کے معمولات سے گزرتا ہوا،رات کا کھانا کھا کر چند منٹ کی سیر کے لئے نکلا۔

اپنے گھر کے قریب کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے عجیب سی روشنی محسوس ہوئی،سٹریٹ لائٹس سے بالکل مختلف،جیسے مستقبل کے کسی دَور کی کوئی روشنی ہو۔اسی روشنی میں یکا یک ایک نوجوان دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔اس نے ایک بریف کیس مجھے تھماتے ہوئے کہا اس میں ۳۵ ملین یورو مالیت کے قیمتی ہیرے اور سونے کے بسکٹ ہیں۔پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔آپ اسے لے لیں،میری طرف سے آپ کے لئے تحفہ ہوا۔اور پھر وہ نوجوان آناً فاناً غائب ہو گیا۔مجھے لگا جیسے میرے سارے منصوبے پورے کرنے کے لئے خدا نے کوئی آسمانی مدد

بھیج دی ہے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دَم تیز ہوگئی۔ میں اپنی سیر کو ادھورا چھوڑ کر گھر کی طرف واپس پلٹا لیکن ابھی میں اپنی بلڈنگ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ سائرن بجاتی ایک پولیس کار میرے قریب آ کر رُک گئی۔ پولیس والے مجھ سے اُسی نوجوان کی بابت پوچھ رہے تھے لیکن میرے جواب دینے سے پہلے ہی اُن کی نظر میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس پر پڑ گئی۔ تب مجھے بائبل کی ایک آیت یاد آئی:

''ہم سونے کو آگ سے اور انسان کو سونے سے آزماتے ہیں''

پولیس مجھے گرفتار کر رہی تھی، اسی لمحے مستقبل کے کسی دَور جیسی عجیب سی روشنی غائب ہوگئی اور میں نے سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے دوسری طرف پولیس نے ایک نوجوان کو گرفتار کیا ہوا ہے۔ اس کا بریف کیس پولیس کی تحویل میں ہے۔ وہ نوجوان بالکل وہی تھا جو کچھ دیر پہلے مجھے اپنا بریف کیس دے گیا تھا۔ لیکن اب نہ تو میرے پاس کوئی بریف کیس تھا اور نہ ہی پولیس نے مجھے کوئی ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔ تو پھر جو کچھ مجھ پر گزرا، یا میں نے محسوس کیا وہ سب کیا تھا؟ کیا میں نے کوئی کشفی نظارہ سا دیکھا تھا یا کسی روشنی نے مجھے اپنے وقت سے چند منٹ پہلے کا سفر کرا کے پھر واپس اپنے مقام پر چھوڑ دیا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لیکن کچھ سمجھ آ بھی رہی تھی۔

کل رات والے نظارے یا تجربے کے بعد ساری رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آسکی تھی اور آج جب میں جاب پر جانے لگا ہوں تو طبیعت کافی بوجھل ہے۔ گھر سے باہر نکلا تو گہرے بادل اور دھند ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیئے۔ ہیٹرس ہائم ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو ریلوے کے عملہ کی طرف سے اعلان ہو رہا تھا کہ ویزبادن سے فرینکفرٹ جانے والی ٹرین دس منٹ لیٹ آ رہی ہے۔ دھندلی فضا نے ریلوے اسٹیشن کی روشنیوں کو بھی مدھم کر رکھا ہے۔ اس دوران فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین اپنے ٹھیک وقت پر آ گئی اور میں اپنی عجیب سی عادت کے مطابق دیکھنے لگتا ہوں کہ شاید میرا بیٹا اس میں سے اُتر کر آ رہا ہو۔ فضا کی دھندلاہٹ کے باوجود واقعی میرا چھوٹا بیٹا انجن کے ساتھ والے ڈبے سے نیچے اُترا ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔ میرے



ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ لیکن جیسے جیسے میرا بیٹا قریب آتا جا رہا ہے، میری مسکراہٹ، حیرت آمیز ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اب وہ میرا بیٹا نہیں لگ رہا بلکہ صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ میرے ابا جی میری طرف آ رہے ہیں۔ میں اباجی کا استقبال کرنے کے لئے ان کی طرف آگے بڑھ کر جاتا ہوں۔ لیکن جب ان کے قریب پہنچتا ہوں تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ یہ تو میں خود ہوں!

میں اپنے آپ سے گلے مل رہا ہوں اور ایسے لگ رہا ہے کہ میں خود سے نہیں بلکہ اپنے سارے آبا و اجداد اور اپنی ساری موجودہ اور آنے والی نسلوں کو گلے مل رہا ہوں۔ اسی حالت میں دیکھتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آ رہی ہے۔ دور سے اس کی ہیڈ لائٹ کی چمک اسٹیشن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

مجھے رات والا واقعہ یاد آ جاتا ہے اور میں مزید کسی حیرت میں پڑے بغیر یقین کر لیتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی جو ٹرین کچھ دیر پہلے آ چکی تھی، وہ دراصل اب آ رہی ہے، ٹرین اسٹیشن پر رُک رہی ہے اور میں اس کے سب سے اگلے ڈبے میں سے اپنے اترنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں!

☆☆☆

# تاثرات

**Haider Qureshi's** splendid collection of short stories extends the range of contemporary Urdu writing available in English translation. Qureshi is a philosophical story teller who ranges from the Ramayana to ecological fables and reflections on the experience of immigrant workers in Germany.His is a singular voice which deserves a wider audience. These stories are thoughtful and full of interest.

**Dr. Derek Littlewood, Birmingham City University**

----------

حیدرقریشی کوفکری طور پر میں ایک جدید ترقی پسند افسانہ نگار سمجھتا ہوں کیونکہ ان کے افسانے سماجی زندگی کے خمیر سے تیار ہوتے ہیں اور معاشرے کے دکھ اور مظلوم کی بے بسی ان میں موجود ہے اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے موضوعات ترقی پسند ہیں اور معاشرے کو بدلنے کا آدرش رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی کہانیوں کو سیدھے بیانیہ میں پیش نہیں کیا بلکہ تخلیقی تجربے سے گزر کر ان کے لیے اظہار کی ایسی زبان وضع کی ہے جس میں استعارہ اور علامت دونوں موجود ہیں بلکہ اکثر انہوں نے تصوف کی اصطلاحات اور اساطیری حوالوں سے بھی کام لیا ہے جو انہیں جدید بناتے ہیں۔ حلقہ اربابِ ذوق نے موضوع کے ساتھ ساتھ فن پارے کی ادبی حیثیت کو بھی ضروری قرار دیا تھا۔ سات اور بعد کی ادبی نسلوں کی تربیت زیادہ تر حلقہ ہی میں ہوئی ہے۔ حیدر قریشی بھی فکری طور پر حلقہ ہی کے پروردہ ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں موضوع کی وسعت کے ساتھ ساتھ فنی حوالے بھی موجود ہیں اور وہ فنی جمالیات کے پوری طرح قائل ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔حیدرقریشی کے دونوں افسانوی مجموعے ان کے فنکارانہ سفر کے دو مرحلے ہیں ان میں ایک فنی اور فکری ارتقاء ہے جو ان کی اگلی منزل کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کے مجموعی سفر میں بھی یہ دونوں مجموعے اپنی اہمیت اور پہچان رکھتے ہیں۔

**ڈاکٹر رشید امجد** (اسلام آباد)

حیدرقریشی تاریخ کے جھروکے میں جھانکتے ہیں، تہذیبوں کی سرحدوں کو عبور کرتے



ہیں، مذہبی صحیفوں کی نظریاتی اور روحانی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ انسان کی روح میں اترتے ہیں، اسکے دل کو بلوتے ہیں، اس کے تصور کے ساتھ اڑان بھرتے ہیں اور جسم کی لذت سے بھی آشنا ہوتے ہیں اور یوں کہانیاں روپ بدل بدل کر شیشا گھر میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ حیدرقریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے۔۔۔۔ایسی کہانیوں میں دل کا بے انت پاتال ہے، روح کا سارا آکاش ہے، جسم کی حدوں کو توڑتا ہوا تفکر اور قوت متخیلہ ہے--- انسان اپنی کل ثقافت، جامع تاریخ، اپنے تمام گناہ وثواب کی پونجی لئے اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کدھر جا رہا ہوں؟--- یہ ایسے سوالات ہیں جو مجھے بھی مسلسل ستاتے رہتے ہیں، یہ سب کیا ہے؟ میں کیوں ہوں؟ یہ جیون کیا ہے؟ میں کیوں زندہ ہوں؟ موت کیا ہے؟ روح، غیر روح، وجود، عدم وجود، انسان، خدا، خلا!! حیدرقریشی کی کہانیاں ایسے ہی سوالوں سے پریشان ہیں اسی لئے ان کی کہانیوں میں مجسم وارداتوں کی بجائے تفکر اور احساس کی لطافت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حیدرقریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی شروعات ہیں جو واقعاتی تسلسل اور کہانی پن پر مبنی ہو کر سوال، شک اور فکر کی بنیاد پر کہانی کا شفاف شیشا گھر تعمیر کرتی ہیں۔ اس شیشا گھر میں ہم داخل ہونے کے لئے آزاد ہیں لیکن اس سے باہر نکلنے کے رستے بند ہیں، صرف ایک چھوٹا سا روشن دان کھلا ہے، ہمارے دل کا--- جس میں نہ جانے کہاں سے روشنی کی کرن چھٹک کر آ رہی ہے جس کے ساتھ ساتھ چل کر ہم وقت کے اس نقطہ پر پہنچتے ہیں جہاں سچ ہمارا منتظر ہے۔ جہاں سچ سے ہم معانقہ کرتے ہیں!

**دیویندر اسر** (دہلی)

'عمرلا حاصل کا حاصل' میں درج شدہ سارے افسانے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے اردو افسانے کی مروجہ حدوں کو پار کرنے کی ہمت جٹائی ہے۔ اس سے قبل ہمت، جسارت اور بغاوت کے القاب ان افسانہ نگاروں کے لیے استعمال کیے جاتے رہے ہیں جو روایتی موضوعِ ممنوعہ یعنی جنس کو اپناتے تھے۔ جنس کے بعد سیاسی اور مزاحمتی موضوعات کا معاملہ آتا ہے۔ حیدرقریشی ان موضوعات کے دلدادہ نکلے جو مجذوبوں کو ساجتے ہیں۔ وہ ایسے سوالات کے

جوابات کے متلاشی معلوم ہوتے ہیں جو قریب قریب لا جواب ٹھہرائے جاتے رہے ہیں۔ یہ بڑا کام ہے اور شاید اسی سبب سے ان کے مختصر لیکن 'بڑے افسانے' قاری کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ آخری سطر پڑھنے پر بھی جان نہیں چھوڑتے سوچنے پر مائل اور دہرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حیدر قریشی کا افسانہ پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے ذاتی زندگی کے کسی تجربے سے گزرنا۔ ایسے تجربے سے جو سوچ، کشف اور بشارت سے عبارت ہے۔ **عبداللہ جاوید** (کینیڈا)

یورپ میں مقیم اردو قلم کاروں کی فہرست میں حیدر قریشی صاحب کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا ہے۔ ویسے تو انہوں نے مختلف اصناف ادب میں اپنی محنت و ریاضت سے ممتاز جگہ حاصل کی ہے لیکن افسانے کے میدان میں ان کی مساعی واقعی بہت قابلِ لحاظ ہیں بعض بالکل ہی منفرد خصوصیات کی وجہ سے عصری کہانی کاروں میں ان کا ایک بالکل ہی علاحدہ اور نا قابلِ انکار تشخص متعین ہو چکا ہے۔ **قیصر تمکین** (انگلینڈ)

حیدر قریشی جہاں شاعری میں اپنے فن کو مکمل طور پر منوا چکے ہیں وہاں اُن کے افسانے بھی اُردو ادب میں اپنے منفرد اور جدت و ندرت سے بھرپور ہونے کی بناء پر خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

**منزہ یاسمین** (بھاول پور)

۶۰ء اور ۷۰ء کے عشرے میں جہاں دیگر افسانہ نگار خارجی حقائق سے دلبرداشتہ ہو کر باطنی تجربہ کو کہانی میں وقوعہ بنا رہے تھے وہاں حیدر قریشی خارج سے کٹ کر گیان دھیان کے فلسفے کو عمل میں لا کر کہانی کی نئی جہت کی تلاش میں مگن تھا۔ حیدر قریشی کا بنیادی فلسفہ 'ہمہ اوست' ہے۔ وہ کائنات اور دیگر تمام مظاہر کو ایک بڑے نامیاتی کل کا جزو مانتے ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میں نے 'جزو' کہا ہے عموماً وحدۃ الوجود کی تعریف کرتے ہوئے بعض دانشور 'ایک بڑے کل کے حصے' خیال کرتے ہیں۔ 'حصہ' ہونے سے وجود کی وحدانیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ جبکہ 'جزو' اس کل کا ایسا حصہ ہوتا ہے جو دوبارہ اپنی جگہ پر قائم ہو سکتا ہے۔

حیدر قریشی کا نظریہ حیات یہ ہے کہ کائنات ایک 'کل' کی حیثیت سے وجود رکھتی ہے گویا وہ تمام اشیاء میں وحدت کی کارفرمائی کو بنیادی عنصر خیال کرتے ہیں۔ وحدۃ الوجود کا یہ تصور ہند سے فارس



اور فارس سے اسلام کا حصہ بنا ہو یا صوفیا کے باطنی تجربہ کی اختراع ہو یہ امر طے شدہ ہے کہ اس نے حیات انسانی پر متنوع اثرات مرتب کیے ہیں۔ حیدر قریشی کا نمایاں وصف مذہبی اساطیر کو کہانی کا حصہ بنا کر ان کے ذریعے سے سماجی مسائل کا اظہار ہے۔ ان کی کہانیوں کا داستانوی رنگ تقاضا کرتا ہے کہ موضوعاتی سطح پر ایک ایسا تلمیحاتی و استعاراتی نظام وضع کیا جائے جو انسان کے لیے نہ صرف یہ کہ تاریخی حیثیت کا حامل ہو بلکہ عصر حاضر میں اس کی اہم ضرورت بھی ہو۔ مذہب کسی معاشرت کا فعال حصہ ہوتا ہے۔ گو کہ ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ ثقافت مذہب کے بطن سے پھوٹتی ہے یا مذہب مقامی ثقافت میں ڈھل جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ حیدر قریشی بلا شبہ اپنے عہد کا نباض افسانہ نگار ہے۔ جو تلخ سماجی حقیقتوں کے گھونٹ پیتا ہے اور پھر اپنے قاری کو کہانی سنانے بیٹھ جاتا ہے تو اس کی دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ان حقائق سے بھی آگاہ کر دیتا ہے جن سے قاری بے خبر ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کا کہانی کہنے کا انداز تیکھا مگر دلنشیں ہے وہ قاری کو حیرتوں میں گم کر دیتے ہیں تو ساتھ ہی اسے نئی دنیاؤں کے راستے بھی سجھاتے ہیں۔ گویا ان کا فلسفہ عمل کا فلسفہ ہے۔ اور وہ سب سے پہلے انسانوں کے درمیان مذہب کی دیوار، سماج کی دیوار اور طبقے کی دیوار گرا کر اسے اس بے گانگی سے نجات دلانا چاہتا ہے جس نے اس کی زندگی کی شہزادی کو سامری جادوگر کے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ حیدر قریشی تمام انسانوں کو ایک شمار کرتے ہیں اور بلاشبہ انسان دوستی کے بہت بڑے پرچارک ہیں۔ **کامران کاظمی** (اسلام آباد)

آپ کی کہانیوں سے مجھے کوئی بیتی خوشبو آئی ہے۔ ٹھہریئے میں اگر جلا لوں--- میں اگر جلا آیا ہوں اور خوشبو میں بھیگتے ہوئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ مجھے آپ کا کہانی بننے کا ڈھنگ نویکلا لگا ہے"۔

**مسعود منور** (ناروے)

(روشن نقطہ) اپنی نوعیت کا بہت خوبصورت اور حیدر قریشی صاحب کی مخصوص چھاپ لگا افسانہ ہے۔ میرے محدود علم کے مطابق اس رنگ میں ابھی تک حیدر صاحب سے اچھا افسانہ کسی نے نہیں لکھا۔ تصوف اور روحانی واردات کا حسین امتزاج۔ **جمیل الرحمن** (انگلینڈ)

☆☆☆